جاری کردہ
سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ماہنامہ

ترجمان القرآن

ستمبر ۱۹۹۵

مدیر : خرم مراد

ادارۂ ترجمان القرآن

سیکڑوں اور ہزاروں پاکستانی یورپ کا رخ کرتے ہیں' ان صداؤں کی آواز پر' جو مغرب میں بجتے ہیں اور سنائی دیتے ہیں۔ روانہ ہوتے ہیں'

- رزق کی تلاش میں؟
- حصول علم کے لیے؟
- اور کس کے لیے؟

زمینی سفر پر' جو ذہنی سفر بن جاتا ہے اور تہذیبوں کا سفر بھی اور اپنی شناخت کی تلاش میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش میں ڈھل جاتا ہے۔

"گھر کی تلاش"

ایک ایسی معنی خیز روداد ہے' ان ان گنت نوجوانوں کی داستان' جو یورپ میں جا بستے ہیں۔

صحافی' ادیب اور محقق سجاول خان رانجھا کے سحر آفریں قلم سے آٹھ سالہ قیام یورپ کا احوال

جسے ۱۹۹۳ء کی بہترین کتاب کا ادبی ایوارڈ ملا۔

حالات و واقعات' شخصیات و نظریات' مذہب و نفسیات' تاریخ و جغرافیہ اور طنز و مزاح پر مشتمل ایک نہایت خوبصورت اور دلچسپ ایوارڈ یافتہ سفرنامہ جسے شروع کر بیٹھے تو آپ ختم کیے بغیر سو نہ سکیں گے۔

صفحات: ۲۳۲	قیمت: ۹۰ روپے

تقسیم کنندہ: بک پروموٹرز' بلاک ۱۹ نصر چیمبر' مرکز ایف سیون'

اسلام آباد فون: ۱۲۳۰۹۲

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مدیر: خرم مراد

جلد ۱۲۱ | ستمبر ۱۹۹۵ء ربیع الثانی ۱۴۱۶ھ | ۹

ترتیب

ادارتی امور

منصورہ، ملتان روڈ، لاہور ۵۴۵۷۰

فون ۷۵۲۰۰۳۳

فیکس ۴۸۳۲۱۹۴

انتظامی امور

۵-اے، ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

فون ۷۵۸۷۹۱۶ - ۷۵۸۵۵۹۰

☆

قیمت فی شمارہ — ۱۲ روپے

زرِ سالانہ — ۱۲۰/ روپے

مشرق وسطیٰ — ۵۵۰ روپے

بنگلہ دیش، مسقط — ۵۰۰/ روپے

بھارت — ۳۰۰/ روپے

یورپ، مشرق بعید — ۶۵۰/ روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا — ۹۰۰/ روپے

○

بینک ڈرافٹ

بنام ماہنامہ ترجمان القرآن ارسال فرمائیں

۶۰ سال پہلے

چینی مسلمان: تالیف بدر الدین چینی 'بی-اے' ضخامت : ۲۴۲-قیمت : ۲ روپے ۸ آنے - دار المصنفین اعظم گڑھ۔

دنیا کے ملکوں میں ہندستان کے بعد مسلمانوں کی سب سے زیادہ تعداد چین میں ہے' جہاں چار کروڑ سے سات کروڑ تک ان کی آبادی کا اندازہ کیا گیا ہے--- یہ پہلا موقع ہے کہ ہمارے سامنے خود ایک چینی مسلمان ہماری اپنی زبان (اردو) میں اپنی قوم کے حالات بیان کر رہا ہے --- کتاب اس قدر دلچسپ ہے کہ ہم نے ایک ہی نشست میں اس کو پڑھ ڈالا' اور جب تک پوری ختم نہ کرلی' ہاتھ سے نہ چھوڑا--- اس کا بیان ہے کہ اسلام عہد عثمانی میں بحری راستے سے اور عہد اموی میں بری راستے سے چین پہنچا اور نہایت احترام کے ساتھ اس کا خیر مقدم کیا گیا۔ مسلمانوں کے علوم و فنون اور ان کی تہذیب کے ثمرات سے شاہان چین نے بہت کچھ استفادہ کیا۔ اور چینی تہذیب کی تعمیر میں ان سے مدد لی۔ سترہویں صدی عیسوی کے وسط تک مسلمان اس ملک میں بہت عزت کے ساتھ رہے۔ اس کے بعد مانچو خاندان کا دور شروع ہوا جس میں مسلمانوں کو ہر طریقے سے تباہ و برباد اور ذلیل و خوار کرنے کی کوشش کی گئی--- اب چین میں پانچ قومیں آباد ہیں' جن میں عزت اور مرتبے کے اعتبار سے مسلمانوں کا نمبر دوسرا ہے۔ اگرچہ مانچو قوم کے مظالم نے مسلمانوں کی قوت کو بہت کچھ توڑ دیا ہے لیکن اسلام نے اپنے پیروؤں میں قومی امتیاز' اور اپنی اسلامی قومیت پر فخر و ناز کی جو روح پھونک دی ہے' اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ڈھائی سو برس تک پامال ہونے کے باوجود چینی مسلمان کی روح پامال نہ ہو سکی' اس نے اپنی تہذیب کو کسی طاقتور سے طاقتور چینی قوم کی تہذیب میں بھی ضم نہ ہونے دیا اور اس وقت بھی وہ اتنی زبردست قومی طاقت رکھتا ہے کہ ایک طرف جاپان اپنی سیاسی اغراض کے لیے اس کی ہمدردی حاصل کرنا چاہتا ہے اور دوسری طرف چینی جمہوریت اپنے وطن کی حفاظت کے لیے اس کی تائید حاصل کرنے پر مجبور ہے۔

مصنف نے مسلمانان چین کی کمزوریوں کا جو حال بیان کیا ہے وہی حال م و بیش اس وقت ہندستان کے مسلمانوں کا بھی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ چین کے مسلمانوں کی سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ ان کو کوئی ایسا راہ نما میسر نہیں جو دین اور دنیا کو جمع کر کے انھیں مسلمان ہونے کی حیثیت سے ترقی کی راہ پر چلائے۔ جو دینی پیشوا ہیں' وہ جاہل' تنگ نظر اور پست حوصلہ ہیں۔ جو دنیوی اعتبار سے ترقی یافتہ ہیں ان کو مذہب سے کچھ بھی لگاؤ نہیں۔ (سید ابوالاعلیٰ مودودی' جلد ۶' عدد ۶' ستمبر ۱۹۳۵)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

'فکرِ مودودی' کیا ہے؟

پیغامِ قرآنی کی ترجمانی' سید مودودی کی زبانی

خرم مراد

سیدِ ابوالاعلیٰ مودودی (۱۹۰۳-۱۹۷۹) ہمارے دَور کی ایک عہد آفریں اور عہد ساز شخصیت تھے۔ انھیں اللہ تعالیٰ نے یہ توفیق عنایت کی کہ انھوں نے اس کے بخشے ہوئے قلم سے اَن گنت دلوں میں ہل چل مچائی' ذہنوں کو مسخر کیا' زندگیوں کا رخ بدلا' انھیں اللہ کی راہ پر لگایا' اور یوں اللہ کی زمین پر اللہ کے دین کی شہادت اور اقامت کے لیے جہاد کی ایک تحریک برپا کر دی۔ ساتھ ہی ساتھ' انھوں نے نصف صدی کے لگ بھگ اللہ کی دی ہوئی قوت کی ہر رمق لگا کر اس تحریک کو' مرحلہ بہ مرحلہ' ایسی زبردست مجاہدانہ عزیمت اور حکیمانہ بصیرت کے ساتھ چلایا کہ موجودہ دور میں غلبۂ دین کے کام کے لیے راستے کھل گئے' اور چلنے والوں کے لیے راہ نمائی کا بیش بہا سامان فراہم ہو گیا۔ آج دنیا میں شاید ہی کوئی مقام ایسا ہو گا جہاں غلبۂ اسلام کے لیے جدوجہد ہو رہی ہو اور اس میں سید مودودی کے افکار و عمل کے نقوش اور خوشبو موجود نہ ہوں۔

ان کے قلم' ان کے افکار' ان کے عمل' اور ان کی آواز میں اس بے پناہ زور و قوت اور حیرت انگیز اثر آفرینی کا راز کیا ہے؟ یہ' اور صرف یہ' کہ وہ پیغامِ قرآنی کے ترجمان تھے' جس کی تعلیم ربِ رحمن نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے انسان کو دی ہے! نہ ان کا پیغام نیا تھا' نہ ان کی فکر' نہ ان کی تحریک۔ جو بات نئی تھی' جس نے ان کی ترجمانیِ قرآن کو دورِ حاضر کے لیے مطابقِ حال اور اثرانگیز بنا دیا' وہ یہ تھی کہ انھوں نے قرآن کی تعلیمات کے اصل معانی کو زندہ کیا' ان میں نئے سرے سے روح پھونکی' ان کو کل کی زبان کے ساتھ آج کی زبان کے جام میں بھی پیش کیا' دین اور زندگی میں

انھیں وہی مقام دیا جو قرآن نے دیا تھا اور جس سے وہ ہٹ چکی تھیں' روزمرہ کی چلتی پھرتی زندگی کے ساتھ' پوری کی پوری زندگی کے ساتھ ان کا وہ تعلق قائم کیا جو قرآن کو مطلوب تھا اور جو کٹ چکا تھا اور ان کے درمیان باہم وہ ربط و تناسب بحال کیا جو قرآن نے قائم کیا تھا اور جو درہم برہم ہو چکا تھا۔ یہی دراصل ان کا سب سے بڑا فکری کارنامہ ہے۔ اسی کا نام احیاے اسلام ہے۔

وہ خود کہتے ہیں: ”ہم اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ اسلام کی ان تمام اصطلاحات میں پھر وہی معنی پیدا کریں جو فی الاصل ان کے اندر پنہاں تھے' اور کلمہ اسلام کے ماننے اور بولنے والے اسے اس کے پورے معنی کے ساتھ نہ صرف مانیں اور بولیں بلکہ اپنی پوری زندگی میں اسی شعور کا اظہار کریں“ (روداد جماعت اسلامی' ر ج' ج ۲' ص ۱۰۱)۔

چونکہ ان کی فکر کوئی نئی فکر نہ تھی' عین ترجمان قرآن تھی' اس لیے انھوں نے انتہائی شدت کے ساتھ اس بات کا اہتمام کیا کہ ان کے افکار و آرا پر ”فکر مودودی“ کی چھاپ نہ لگے' ان کے گرد ”فکر مودودی“ کے نام سے کوئی مسلک نہ بننے پائے' ان کی تحریک امت مسلمہ میں ”مودودی جماعت یا فرقہ“ بن کر نہ رہ جائے اور ان کی جماعت میں شامل ہونے والا کوئی شخص قرآن و سنت کے ماسوا کسی کو' بشمول ان کے' معیار حق ماننے کا پابند نہ ہو۔

۱۹۴۱ میں جماعت کے بنتے ہی انھوں نے شدومد کے ساتھ تاکید کی: ”ارکان جماعت کو میں خداوند برتر کا واسطہ دے کر ہدایت کرتا ہوں کہ کوئی شخص فقہی کلامی مسائل میں میرے اقوال کو دوسروں کے سامنے حجت کے طور پر پیش نہ کرے۔ اسی طرح میرے ذاتی عمل کو بھی“ (ر ج' ج ۱' ص ۳۴)۔ اس ہدایت کی مزید وضاحت انھوں نے ایک سائل کو جواب دیتے ہوئے کی: ”جماعت اسلامی میں شامل رہنے یا نہ رہنے کے لیے میری تحریروں سے اتفاق ہرگز ضروری نہیں ہے۔ یہ بات میں نے اسی روز کہہ دی تھی جس روز جماعت اسلامی کی تشکیل ہوئی تھی“ (ماہنامہ ترجمان القرآن - ت ق' ستمبر ۷۶' رسائل و مسائل - ر م' ج ۵' ص ۸۹)۔ پھر کسی بھی قسم کی غلط فہمی کے ہر امکان کو ختم کرنے کے لیے انھوں نے واشگاف الفاظ میں اعلان کیا: ”میں واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں نے نہ کسی دینی منصب کا دعویٰ کیا ہے' نہ اپنی ذات کی طرف دعوت دی ہے۔ اس لیے میرے کوئی ”معتقدین“ ہیں ہی نہیں۔ میں اور میرے ساتھی صرف اللہ اور اس کے رسولؐ کے معتقدین ہیں' اور ہمارا تعلق صرف راہ خدا میں ہم سفری کا ہے“ (ت ق' ستمبر ۵۵' ر م' ج ۴' ص ۲۷۹)۔

اپنے نام پر کسی فکری و فقہی مسلک قائم نہ ہونے دینے کے لیے ان کا اہتمام بالکل بجا' مگر اس

حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ سید مودودی کی فکری خدمات ملت اسلامیہ کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان سب کا احاطہ تو ممکن نہیں لیکن جو خدمات بنیادی نوعیت کی ہیں انھیں ہم یہاں اجاگر کرنا چاہتے ہیں۔

ان کی سب سے بڑی خدمت 'اسلام کا فکری احیا' ہے۔ اس کی قدر و قیمت سمجھنی ہو تو یہ سمجھنا ضروری ہے کہ اس وقت مسلمانوں کے ہاتھوں اسلام کیا بن چکا تھا۔ وہ خود ۱۹۳۸ء میں پٹھان کوٹ میں ان پڑھ دیہاتیوں کے سامنے ایک بڑی عام فہم تمثیل کے ذریعے صورت حال کی بڑی جامع اور مؤثر تصویر کشی کرتے ہیں:

یہ گھنٹا جو آپ کے سامنے ٹنگ رہا ہے ... اس میں بہت سے پرزے ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ جب اس کو کوک [چابی] دی جاتی ہے تو سب پرزے اپنا اپنا کام شروع کر دیتے ہیں

اگر آپ اسے کوک نہ دیں تو یہ وقت نہیں بتائے گا۔ اگر آپ کوک دیں لیکن اس قاعدے کے مطابق نہ دیں جو کوک دینے کے لیے مقرر کیا گیا ہے 'تو یہ بند ہو جائے گا' یا چلے گا بھی تو صحیح وقت نہ بتائے گا۔ اگر آپ اس کے بعض پرزے نکال لیں اور پھر کوک دیں 'تو اس کوک سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اگر آپ اس کے بعض پرزوں کو نکال کر سنگر مشین کے پرزے لگا دیں اور پھر کوک دیں 'تو یہ نہ وقت بتائے گا نہ کپڑا سیے گا۔ اگر آپ اس کے سارے پرزے اس کے اندر ہی رہنے دیں لیکن ان کو کھول کر ایک دوسرے سے الگ کر دیں 'تو کوک دینے سے کوئی پرزہ بھی حرکت نہ کرے گا

اسلام کو اس گھنٹے پر قیاس کر لیجیے [دین کے عقاید و اخلاق کے اصول اور دنیا کی ہر چیز کے حقوق سے لے کر حکومت کرنے کے قوانین تک] یہ سب اسلام کے پرزے ہیں' اور ان کو گھڑی کے پرزوں کی طرح ایک ایسی ترتیب سے ایک دوسرے کے ساتھ کسا گیا ہے کہ جونہی اس میں کوک دی جائے ... دنیا پر خدائی قانون کا تسلط۔ ... مسلسل ظاہر ہونا شروع ہو جائے

[لیکن اب] سارے پیچ ڈھیلے ہو گئے اور پرزہ پرزہ الگ ہو کر بکھر گیا۔ ... آپ نے اس گھڑی کے بہت سے پرزے نکال ڈالے اور ان کی جگہ کوئی صاحب سنگر مشین کا پرزہ پسند کر کے لے آئے کسی صاحب کو آٹا پیسنے کی چکی کا کوئی پرزہ پسند آگیا تو وہ اسے اٹھا لائے۔ اب آپ مسلمان بھی ہیں اور بینک سے سودی کاروبار بھی چل رہا ہے ... کفر کی وفادارانہ خدمت بھی ہو رہی

ہے --- غرض کوئی غیر اسلامی چیز ایسی نہیں رہی جسے ہمارے بھائی مسلمانوں نے لا لا کر اسلام کی اس گھڑی کے فریم میں ٹھونس نہ دیا ہو۔

یہ سب حرکتیں کرنے کے بعد اب آپ چاہتے ہیں کہ کوک دینے سے یہ گھڑی چلے --- کاش میں آپ کی ہاں میں ہاں ملا سکتا مگر میں کیا کروں [جس حالت میں آپ اس وقت ہیں] عمر بھر کوک دیتے رہیے گھڑی نہ چلتی ہے نہ چلے گی" (خطبات - خ ط ، ص ۱۷۱ تا ۱۷۸)۔

سید مودودی نے فکر کی سطح پر باہر سے لاکر ٹھونسے ہوئے پرزوں کو نکال باہر کیا' جن پرزوں کو' مثلاً معاملات' سیاست' جہاد وغیرہ کو مسلمانوں نے ذہناً و عملاً دین سے باہر کر دیا تھا انھیں دوبارہ فٹ کیا' ہر پرزے کو' مثلاً ظاہر و باطن اور اصول و فروع کو صحیح ترتیب سے صحیح مقام پر بحال کیا' خصوصاً اس کوک کو جو سارے گھنٹے کو چلاتی ہے' یعنی ایمان کو' اور جن پرزوں کا ربط ٹوٹ گیا تھا مثلاً ایمان اور عمل کا' ان کو دوبارہ جوڑا۔ اس ضمن میں:

۱- سب سے پہلے اور سب سے بڑھ کر' انھوں نے ایمان حقیقی کی بازیافت کی' جو اللہ کے نزدیک قابل قبول ہو' اس کی جنت میں لے جائے' اور دنیا میں غلبہ و سربلندی اور خلافت ارضی کا مستحق بنائے۔ یہی ان کی زندگی بھر کی کوششوں کا محور تھا' اس لیے کہ یہی پیغام قرآنی کا خلاصہ ہے: اے ایمان لانے والو' ایمان لاؤ (النساء ۴:۱۳۶)۔ انھوں نے موروثی اور رسمی ایمان کو' جس کا ربط زندگی سے کٹ چکا تھا' یا جسے زندگی کے کونے کھدرے میں رکھ دیا گیا تھا' ایک دفعہ پھر زندگی' پوری کی پوری زندگی کا' مرکز بنا دیا' ایسا مرکز جس کے دائرے سے ایک انچ زندگی بھی باہر نہیں رہ سکتی' ورنہ وہ کفر کے مترادف ہوگی۔ انھوں نے ایمان کے عوض پوری ذات اور زندگی کا سودا چکانا سکھایا' ایسا سودا جس میں جان و مال کی ہر رمق اللہ کے ہاتھ بک جاتی ہے:

"ایمان کا اقرار کرنے کے بعد تمھیں یہ کہنے کا کیا حق ہے کہ جان میری ہے' جسم میرا ہے' مال میرا ہے' فلاں چیز میری ہے اور فلاں چیز میری ہے۔ دوسرے کو مالک کہنا' اور پھر اس کی چیز کو اپنی قرار دینا' بالکل ایک لغویات ہے --- تم اپنے ان ہاتھوں اور پاؤں کو بھی اس کی پسند کے خلاف ہلانے کا حق نہیں رکھتے' تم ان آنکھوں سے بھی اس کی مرضی کے خلاف دیکھنے کا کام نہیں کر سکتے' تم کو اس پیٹ میں بھی کوئی ایسی چیز ڈالنے کا حق نہیں ہے جو اس کی مرضی کے خلاف ہو' تمھیں ان زمینوں اور جانداروں پر بھی مالک کی منشا کے خلاف کوئی حق حاصل نہیں ہے --- " (خ ط ، ص ۵۹)۔ اسی طرح' کلمہ پڑھتے ہی' اللہ کے کلام اور اس کے رسول کی سنت کے مقابلے میں" آپ کو یہ کہنے کا حق ہی نہ رہا کہ میری رائے یہ ہے' یا دنیا کا دستور یہ ہے' خاندان کا رواج یہ ہے' یا فلاں حضرت یا فلاں

بزرگ یہ فرماتے ہیں"۔ (خ ط 'ص ۵۱)

ایمان کا عملی تقاضا ہے "خدا کے مقابلے میں اپنی آزادی و خود مختاری سے دستبردار ہو جانا' اور اس کی بادشاہی و فرماں روائی کے آگے سر تسلیم خم کر دینا"۔ چنانچہ سید مودودی کے نزدیک "جو اپنے معاملات کو اپنے ہاتھ میں رکھے یا خدا کے سوا کسی اور کے سپرد کر دے وہ مسلمان نہیں ہے" (خ ط 'ص ۵۰)۔

سید مودودی نے ایمان کا حقیقی مفہوم ہی واضح نہیں کیا' انھوں نے ہر اس بت پر بھی ضرب کاری لگائی جو زندگی کے معاملات میں حاکم بن جاتا ہے' دل میں خدا بن کر بیٹھ جاتا ہے' اور ایمان کو غارت کر دیتا ہے۔ وہ کہتے ہیں: اپنا نفس' خاندان اور معاشرہ کا رواج اور چلن' اور دنیا کے لوگ' ان میں سے ہر ایک خدا ہے اگر اللہ کے ماسوا اس کی اطاعت کی جائے۔ چنانچہ "جو شخص مسلمان بننا چاہتا ہو اس کو سب سے پہلے ان تینوں بتوں کو توڑنا چاہیے--- ان کی بندگی اصل شرک ہے۔ آپ نے پتھروں کے بت توڑ دیے' اینٹ اور چونے سے بنے ہوئے بت ڈھا دیے' مگر سینوں میں جو بت خانے بنے ہوئے ہیں ان کی طرف کم توجہ کی" (خ ط 'ص ۹۰)۔ جس کی زندگی کا جو حصہ اور جو فعل خدا کے قانون کے خلاف اور ان تینوں کا مطیع ہو' وہ "اسی قدر کفر میں مبتلا ہے۔ کوئی آدھا کافر ہے' کوئی چوتھائی کافر ہے' کسی میں دسواں حصہ کفر کا ہے اور کسی میں بیسواں" (خ ط 'ص ۸۲)۔

انھوں نے اس پر شدت کے ساتھ زور دیا کہ وفاداری بشرط استواری اصل ایمان ہے' اور حب الٰہی ایمان حقیقی کا اصل معیار۔ ایک مکمل اسلامی زندگی کی عمارت صرف ایسے ایمان پر اٹھ سکتی ہے جب "آدمی اپنی تمام ان وفاداریوں کو دریا برد کر دے جو خدا کی وفاداری کے تابع نہ ہوں بلکہ اس کے مدمقابل بنی ہوئی ہوں' یا بن سکتی ہوں۔ اپنے دل میں سب سے بلند مقام پر خدا کی محبت کو بٹھائے اور ہر اس بت کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر اپنے نہاں خانہ دل سے نکال پھینکے جو خدا کے مقابلے میں عزیز تر ہونے کا مطالبہ کرتا ہو"۔ (اسلامی نظام زندگی اور اس کے بنیادی تصورات۔ ن ز 'ص ۲۲۸-۲۲۹)۔ یہی خلاصہ ہے ایمان کی بازیافت کا۔

۲- ایمان کو مرکز زندگی بنانے کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ عمل اس کے تقاضوں کے مطابق ہو' ایمان کے بیج سے پھوٹنے والی زندگی کی ہر شاخ' عمل صالح کے پھلوں' پھولوں' پتیوں سے لدی ہوئی ہو۔ اسی لیے قرآن مجید نے ایمان اور عمل صالح کا ذکر لازم و ملزوم کے طور پر ساتھ ساتھ کیا۔ بدقسمتی سے' تکفیر کے ابتدائی فتنوں کی وجہ سے' جب ایمان کی قانونی تعریف پر زور دیا گیا' تو ایمان و عمل کے درمیان یہ رشتہ لاینفک ذہنوں میں مدھم یا مفقود ہو گیا' اور عمل میں انتہائی ضعیف۔ سید

مودودی نے دوسرا کام یہ کیا کہ ان دونوں کا تعلق ایک دفعہ پھر استوار کیا۔

مسلمان اور کافر کے درمیان فرق کیوں ہے' وہ یہ سوال بار بار اٹھاتے ہیں' اور ہر بار ایک ہی جواب دیتے ہیں: علم اور عمل کی وجہ سے۔ "کافر بھی آدم کی اولاد ہے اور تم بھی۔ کافر بھی ایسا ہی انسان ہے جیسے تم ہو۔ وہ بھی تمھارے ہی جیسے ہاتھ پاؤں' آنکھ کان رکھتا ہے۔ اسی خدا نے اس کو بھی پیدا کیا ہے جس نے تم کو پیدا کیا ہے تمھیں کیوں جنت ملے گی اور وہ کیوں دوزخ میں ڈالا جائے گا؟" اصل فرق نام کا نہیں' لباس کا نہیں' پیدائش کا نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ "ایسا ظلم تو کبھی نہیں کر سکتا کہ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں پر.... ایک بندے کو جنت میں بھیجے اور دوسرے کو دوزخ میں پہنچا دے"۔ لہٰذا "مسلمان کو کافر سے جدا کرنے والی صرف دو چیزیں ہیں: ایک علم' دوسری عمل" (خ ط' ص ۳۶-۳۷)۔

پھر وہ حقیقی ایمان کے لیے عمل کے ناگزیر ہونے پر زور دیتے ہوئے کہتے ہیں: کیا آپ کو اس پر ہنسی نہ آئے گی جو "کسی حکیم سے نسخہ لکھوا کر لائے اور اسے کپڑے میں لپیٹ کر گلے میں باندھ لے یا اسے پانی میں گھول کر پی جائے؟" کیا آپ اسے پاگل خانے نہ بھجوائیں گے جو "علم طب کی کوئی کتاب لے کر پڑھنے بیٹھ جائے اور یہ خیال کرے کہ محض اس کتاب کو پڑھ لینے سے بیماری دور ہو جائے گی"۔ (خ ط' ص ۴۶)۔ لیکن یہی ساری ستم ظریفیاں مسلمان اللہ کی کتاب کے ساتھ کرتے ہیں۔ اسی طرح "اگر تم زبان سے روئی لحاف پکارنا شروع کر دو' تو سردی لگنی بند نہ ہوگی اگر تم صبح سے شام تک پانی پانی پکارتے رہو تو پیاس نہ بجھے گی۔ بس یہی حال کلمہ طیبہ کا ہے"۔ چنانچہ اگر معنی "دل میں اتریں' اور ان کے زور سے تمھارے خیالات' تمھارے اخلاق اور تمھارے اعمال نہ بدلیں' تو نرے الفاظ بول دینے سے کچھ بھی اثر نہ ہوگا" (خ ط' ص ۵۴-۵۵)۔

۲۔ ایمان کا مطالبہ ہے پوری زندگی میں خدا کی عبادت: یہی قرآن کی دعوت ہے۔ لیکن عبادت کا مفہوم مراسم عبودیت تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ سید مودودی نے عبادت کے معنی کو مراسم عبودیت کی سطح سے اٹھایا' اور' جیسا قرآن کو مطلوب ہے' اسے زندگی کے تمام شعبوں اور انسانی دنیوی کاموں تک پر محیط کر دیا۔ اس طرح نماز روزہ زکوٰۃ وہ ستون بن گئے جن پر صالح زندگی کی عمارت کھڑی ہوتی ہے' یا وہ تنا جو ایمان کے بیج کو اعمال صالحہ کے ثمربار درخت میں تبدیل کرتا ہے۔

کیسی حیرت کی بات ہے کہ جو لوگ "رات دن خدا کا قانون توڑتے ہیں۔ اپنی زندگی کے معاملات میں خدا کے احکام کی پروا نہیں کرتے' ان کی نماز اور روزے اور تسبیح اور تلاوت قرآن کو آپ خدا کی عبادت سمجھتے ہیں"۔ حالانکہ عبادت کچھ اور ہی چیز ہے: "آپ کی ہر جنبش اس حد کے

بسر ہو جو خدا نے آپ کے لیے مقرر کی ہے۔ آپ کا ہر عمل اس طریقے کے مطابق ہو جو خدا نے آپ کے لیے مقرر کیا ہے..... ایسی زندگی میں آپ کا سونا بھی عبادت ہے اور جاگنا بھی' کھانا بھی عبادت ہے اور پینا بھی' چلنا پھرنا بھی عبادت ہے اور بات کرنا بھی' حتیٰ کہ اپنی بیوی کے پاس جانا اور اپنے بچے کو پیار کرنا بھی عبادت ہے (خ ط' ص ۱۳۶)۔ جو ایک خدا کو معبود بنائے وہ "اپنی پوری زندگی کو' خواہ وہ شخصی ہو یا اجتماعی' اخلاقی ہو یا مذہبی' تمدنی و سیاسی اور معاشی ہو یا علمی و نظری' اسی ایک خدا کی بندگی میں سپرد کر دے" (تحریک اسلامی کا آیندہ لائحہ عمل - ل ع، ص ۴۴)۔ نماز روزہ ہو اور اخلاق صالحہ نہ ہوں' اس تناقض پر بھی وہ ضمیر کو جھنجھوڑتے ہیں: یہ کس طرح ممکن ہے کہ آدمی نماز پڑھ کر "جب اپنے کام کاج کی طرف واپس آئے تو جھوٹ بولے؟ بے ایمانی کرے؟ لوگوں کے حق مارے؟ رشوت کھائے اور کھلائے؟ سود کھائے اور کھلائے؟ خدا کے بندوں کو آزار پہنچائے" (خ ط' ص ۱۵۸)۔

۴- ہر مسلمان موت کے بعد حساب کتاب اور جزا سزا پر ایمان رکھتا ہے' لیکن اس ایمان کا اثر اس کی دنیوی زندگی پر نہیں پڑتا۔ چوتھا کام انھوں نے یہ کیا کہ ایک طرف یہ یقین واضح اور مضبوط کیا کہ اصل کامیابی آخرت کی کامیابی ہے' اور دوسری طرف دنیا اور آخرت کی زندگی کا تعلق ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دیا: آخرت میں جو کچھ ملے گا' دنیا کے اعمال کا نتیجہ ہو گا' اس لیے دنیا کا ہر لمحہ' ہر کام اور ہر چیز اہم ہے۔ "دنیا اور آخرت دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں' بلکہ ایک ہی سلسلہ ہے جس کی ابتدا دنیا ہے اور انتہا آخرت..... [یہاں] گیہوں بوئیں گے تو گیہوں پیدا ہو گا' کانٹے بوئیں گے تو کانٹے ہی پیدا ہوں گے' کچھ نہ بوئیں گے تو کچھ نہ پیدا ہو گا" (خ ط' ص ۳۷)۔

۵- دنیا اور آخرت میں کامیابی کے لیے قانون الٰہی کی اطاعت پر جتنا زور سید مودودی نے دیا' اتنا ہی زور انھوں نے اعمال کی اصل حقیقت اور روح پر دیا' اور اسے دلوں میں اتارا۔ اس طرح انھوں نے ظاہری اعمال اور باطنی ترقی کو پھر ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دیا۔ ایک طرف انھوں نے اعمال کے بے مقصد اور بے روح ہو جانے کا ماتم کیا اور اسے مسلمانوں کے اعمال بے اثر ہو جانے کا اصل سبب قرار دیا۔ دوسری طرف انھوں نے بے جان رسمی مذہبیت پر پے در پے ضربیں لگائیں۔

اگر عبادات کی ادائیگی کے باوجود' زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی' نہ مسلمان اللہ سے عہد وفا' وفا کرنے کے لیے کوئی قدم اٹھاتا' تو اس کی وجہ یہ ہے کہ روح رخصت ہو چکی ہے اور اعمال جسد مردہ بن چکے ہیں"۔ "نہ اب نمازوں میں وہ اثر ہے جو کبھی تھا' نہ روزوں میں ہے' نہ قرآن خوانی میں اور نہ شریعت کی ظاہری پابندیوں میں۔ اس لیے کہ جب روح ہی موجود نہیں تو نرا بے جان جسم کیا کرامت

دکھائے گا!" (خ ط، ص ۱۰۱)۔ اگر نماز جیسی زبردست اصلاح کرنے والی چیز سے بھی کسی مسلمان کی اصلاح نہیں ہوتی تو "یہ اس کی طینت کی خرابی ہے، نماز کی خرابی نہیں۔ پانی اور صابن کا قصور نہیں، اس کی وجہ کوئلے کی اپنی سیاہی ہے" (خ ط، ص ۱۵۰)۔

یہ روح کیا ہے؟ خدا کی غیر مشروط اور مکمل وفاداری، اور سب سے بالاتر اس کی محبت! یہ روح جتنی قوی ہوگی، اتنی ہی روحانی اور باطنی ترقی ہوگی۔ ورنہ، روحانی ترقی یہ نہیں ہے کہ "آدمی ایک اچھا ریڈیو سیٹ، ایک طاقت ور دوربین اور ایک نازک خوردبین بن جائے..." (ن ز، ص ۲۶۴)۔ نہ زہد و تقویٰ اور احسان یہ ہے کہ آدمی چند مخصوص شکلوں کی پابندی کرے، مصنوعی طور پر اپنے کو ایسے سانچے میں ڈھال لے جس کی پیمایش کی جاسکتی ہو، چاشت اور اشراق اور تہجد کے نوافل پڑھے، ذکر و شغل اور مراقبہ کرے، مگر ایک نہ ہو" تو وہ حقیقی دینداری جو سر داد نہ داد دست در دست یزید، کی کیفیت پیدا کرے، اور 'بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا' کے مقام وفاداری پر پہنچا دے" (ن ز، ص ۲۴۵-۲۵۱)۔

۶- راہِ خدا میں سر دینے اور قدم یار پر نثار کرنے کی آرزو اور جستجو کا نام جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ قرآن ایمان اور جہاد کے درمیان بھی لازم و ملزوم کا رشتہ قائم کرتا ہے، وہ جہاد کا ذکر ایمان کے ساتھ ایمان کے لازمی تقاضے اور ایمان صادق کی کسوٹی کے طور پر بار بار کرتا ہے۔ سچے مومن وہ ہیں جو جان و مال سے راہ خدا میں جہاد کریں (الحجرات ۴۹:۱۵)۔ عمل صالح کی ایک جامع تعبیر صلوٰۃ و زکوٰۃ ہے، تو دوسری جہاد فی سبیل اللہ۔ لیکن جہاد تمام اعمال میں چوٹی کا عمل ہے۔ امتِ مسلمہ کا مقصد وجود ہے، کہ یہ اس کے مشن کی تکمیل کی جدوجہد ہے۔ اسی لیے قرآن مطالبہ کرتا ہے کہ مومن کو جہاد دنیا کی ہر چیز سے بڑھ کر اس طرح محبوب ہونا چاہیے جس طرح اللہ اور اس کے رسول (التوبہ)۔ جہاد کی پکار بلند ہوتے ہی، وہ ہر عذر کو ترک کر کے اور ہر قربانی دے کر جہاد کے لیے نکل کھڑا ہو۔ لیکن بدقسمتی سے عرصے سے مسلمان یہ سمجھنے لگے تھے کہ جہاد کے لیے انھیں جنبش کرنے کی چنداں ضرورت نہیں، کہ جہاد نہ کرنے سے ان کے ایمان میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

سید مودودی کا سب سے بڑا فکری کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ایمان اور جہاد کے درمیان جو خلیج پیدا ہو چکی تھی اسے پاٹ دیا، جو زنجیر ٹوٹ چکی تھی، اسے جوڑ دیا۔ انھوں نے ایک ایک کر کے قرآن کے پیغام جہاد کے تمام اجزا کو زندہ کیا اور اسے مومن کے قلب و نگاہ میں وہی مقام دیا جو قرآن کو مطلوب ہے۔ یہ بات محض حسن اتفاق نہیں کہ ان کی فکری خدمات کا آغاز ہی الجہاد فی الاسلام جیسی معرکہ آرا کتاب سے ہوا، جس کی نظیر نہ عربی میں ہے نہ اردو میں۔ اس کتاب کے ذریعے انھوں نے

اغیار کی بڑی قلم کاریوں سے بنائی ہوئی اس تصویر کا طلسم بھی توڑ دیا کہ جہاد کی وجہ سے اسلام کی تاریخ سے بوئے خون آتی ہے' یہ اس کی دہشت گردی کا مظہر ہے۔ ان کی نظر میں جہاد سے غفلت ہی وہ مرض ہے جو ہر عمل کی 'خصوصاً نماز' روزے کی جان نکال لیتا ہے: "اب میں تمھیں بتاتا ہوں کہ جس دل میں جہاد کی نیت نہ ہو اور جس کے پیش نظر جہاد کا مقصد نہ ہو اس کی ساری عبادتیں بے معنی ہیں" اور نہ ان سے اسے خدا کا تقرب نصیب ہوتا ہے (خ ط 'ص ۳۱۸)۔ کیونکہ "اگر آپ واقعی اس دین کو حق سمجھتے ہیں تو آپ کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اس دین کو زمین پر قائم کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیں' اور یا تو اسے قائم کر کے چھوڑیں یا اس کوشش میں جان دے دیں" (خ ط 'ص ۳۲۶)۔ یہی کسوٹی ہے ایمان کی صداقت کی۔

جہاد کی یہ اہمیت مسلمانوں کے ذہنوں سے کیوں غائب ہو گئی؟ "یہ سوال مجھ سے نہ کیجیے بلکہ ان لوگوں سے کیجیے جنھوں نے مسلمانوں کی توجہ ان کے اصل مشن سے ہٹا کر نجات اور فلاح اور حصول مقاصد کے لیے شارٹ کٹ تجویز کیے' اسلام کے کلیات اور اصول و مقاصد کو پیٹ کر تاریک گوشوں میں پھینک دیا اور مسلمانوں کے ذہن کو جزئیات کی بحثوں میں ایسا پھنسایا کہ وہ اپنے آپ کو اور اپنے مقصد تخلیق کو اور اسلام کی حقیقت کو قطعی بھول گئے" (ن د 'ص ۳۲۵)۔

۷۔ جہاد کو جو اعلیٰ مقام قرآن نے دیا ہے' اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ صرف وہی امت مسلمہ کے مقصد وجود اور مشن کی تکمیل کا ذریعہ ہے۔ سید مودودی کے سارے فکری کارنامے کا مدعا و مقصود یہی ہے کہ انھوں نے اسلام اور مسلمان کی اصل حقیقت اور امت کے مقصد و مشن کو آشکار کیا' اس کی طرف مسلسل پکارتے رہے' اور ایمانی زندگی اور جہاد کو اس کے تابع کر دیا۔ انھوں نے کہا: اسلام کو عام معنوں میں ایک مذہب سمجھ لیا گیا ہے' حالانکہ "دراصل اسلام ایک انقلابی نظریہ و مسلک ہے جو تمام دنیا کے اجتماعی نظم کو بدل کر اپنے نظریہ و مسلک کے مطابق اسے تعمیر کرنا چاہتا ہے"۔ اسی طرح' مسلمانوں کو عام معنوں میں محض ایک قوم سمجھ لیا گیا ہے' جبکہ "مسلمان اس بین الاقوامی انقلابی جماعت کا نام ہے جسے اسلام اپنے مطلوبہ انقلابی پروگرام کو عمل میں لانے کے لیے منظم کرتا ہے"۔ (ت ق 'م ۲۹' ن د 'ص ۲۹۸)۔ اور ہر دین کی طرح یہ دین بھی یہی کہتا ہے کہ اقتدار خالصتاً و مخلصتاً میرا ہونا چاہیے' اور ہر دوسرا دین میرے مقابلے میں مغلوب ہونا چاہیے" (خ ط 'ص ۳۲۴)۔

اسی لیے "امت بنانے کی واحد غرض جو قرآن میں بیان کی گئی ہے' وہ یہی ہے کہ آپ تمام بندگان خدا پر شہادت حق کی حجت پوری کر دیں یہ آپ کی امت کا عین مقصد وجود ہے' جسے

آپ نے پورا نہ کیا تو گویا اپنی زندگی ہی اکارت گنوا دی" (ن د، ص ۲۲)۔ اور اسی لیے "دین میں امامت صالحہ کے قیام اور نظام حق کی اقامت کو مقصدی اہمیت حاصل ہے، اور اس چیز سے غفلت برتنے کے بعد کوئی عمل ایسا نہیں ہو سکتا جس سے انسان اللہ تعالیٰ کی رضا کو پہنچ سکے اس معاملے میں جو شخص کمزوری دکھائے اس کا ایمان ہی مشتبہ ہے، پھر بھلا کوئی دوسرا عمل اسے کیا نفع پہنچا سکتا ہے۔ اس کے ایمان ہی کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنی تمام سعی و جہد کو اس ایک مقصد پر مرکوز کر دے ...... روئے زمین پر اگر صرف ایک ہی مومن ہو تب بھی اس کے لیے درست نہیں ہے کہ اپنے آپ کو اکیلا پا کر اور ذرائع مفقود دیکھ کر نظام باطل کے تسلط پر راضی ہو جائے، یا --- شرعی حیلے تلاش کر کے غلبہ کفر و فسق کے ماتحت کچھ آدھی پونی مذہبی زندگی کا سودا چکانا شروع کر دے --- (ن ز، ص ۲۱۱ تا ۲۱۳)۔

آدمی اکیلا بھی ہو تو "سیدھا اور صاف راستہ یہی ایک ہے کہ بندگان خدا کو اس طریق زندگی کی طرف بلائے جو خدا کو پسند ہے"۔ کوئی "سن کر نہ دے تو اس کا ساری عمر صراط مستقیم پر کھڑے ہو کر لوگوں کو پکارتے رہنا اور پکارتے پکارتے مرجانا" اس سے بہتر ہے کہ وہ غلط صدائیں بلند کرنے لگے یا غلط راہوں پر چلنے لگے (ن ز، ص ۲۱۳)۔

پھر وہ اقامت دین کے لیے جماعتی زندگی ناگزیر قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں، کہ چونکہ "یہ مقصد اعلیٰ اجتماعی کوشش کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا" اس لیے کوئی بھی سننے والا مل جائے تو "لازم ہے کہ ان کے ساتھ مل کر ایک جتھا بنائے اور یہ جتھا اپنی تمام اجتماعی قوت اس مقصد عظیم کے لیے جدوجہد کرنے میں صرف کر دے" (ن ز، ص ۲۱۳)۔

خدا کا حکم ماننے میں آزمایشوں اور جہاد میں قربانیوں سے مفر نہیں۔ وہ ان کے لیے بھی تیار کرتے ہیں: "مالک کی مرضی کے مطابق کام کرنے میں کوئی نقصان ہوتا ہے تو ہوا کرے۔ جان جاتی ہو تو جائے، ہاتھ پاؤں ٹوٹتے ہیں تو ٹوٹیں، اولاد کا نقصان ہوتا ہے تو ہو، مال و جائیداد برباد ہو تو ہوا کرے، تمھیں کیوں غم ہو؟ جس کی چیز ہے وہی نقصان پسند کرتا ہے تو اس کو حق ہے" (خ ط، ص ۶۰)۔

۸۔ اگر تاریخ کا عمل صرف اندھی مادی و طبعی قوتوں کا کھیل ہو، تو ایمان لازماً زندگی کے کونے کھدرے میں پہنچ جاتا ہے۔ مگر قرآن کے اتباع میں، سید مودودی ایمان کو، دل کی طرح، تاریخ میں بھی مرکز و محور بنا دیتے ہیں۔ قوموں کا مقدر ایمان اور اخلاق کی میزان میں تلتا ہے، اور اٹھتا اور گرتا ہے۔ "اخلاقی قوانین ہی انسان کے عروج و زوال پر فرماں روا ہیں" (ن ز، ص ۲۱۷)۔ "اخلاقی طاقت کی فراوانی مادی وسائل کے فقدان کی تلافی کر دیتی ہے، مگر مادی وسائل کی فراوانی اخلاقی طاقت کے فقدان کی تلافی کبھی نہیں کر سکتی" (ت ن، ص ۲۴۲)۔ اس تناظر میں وہ بار بار امت مسلمہ کی حالت زوال کا

ذکر کرتے ہیں' اور بار بار زور دے کر کہتے ہیں کہ تمھارا مقدر' تمھاری موجودہ ذلت و غلامی اور مستقبل کی سربلندی صرف ایمان اور جہاد سے وابستہ ہے۔

"کیسی عجیب بات ہے کہ مسلمان اور اس پر خدا کا غضب نازل ہو! مسلمان اور ذلیل ہو! مسلمان اور غلام ہو! یہ تو ایسی ناممکن بات ہے جیسے کوئی چیز سفید بھی ہو اور سیاہ بھی"۔ (خ ط' ص ۴۰)۔ "یہ قطعی ناممکن ہے کہ کوئی قوم خدا کے کلام کی حامل ہو اور پھر دنیا میں ذلیل و خوار ہو' دوسروں کی محکوم ہو' پاؤں میں روندی اور جوتیوں سے ٹھکرائی جائے' اس کے گلے میں غلامی کا پھندا اور غیروں کے ہاتھوں میں اس کی باگیں ہوں اور وہ اس کو اس طرح ہانکیں جیسے جانور ہانکے جاتے ہیں" (خ ط' ص ۴۸)۔

یہ صورت حال کیوں ہے؟ "کیا نعوذ باللہ تمھارا خدا ظالم ہے؟ --- اگر تمھارا ایمان ہے کہ خدا ظالم نہیں ہے' اور اگر تم یقین رکھتے ہو کہ خدا کی فرماں برداری کا بدلہ ذلت سے نہیں مل سکتا' تو پھر تمھیں ماننا پڑے گا کہ مسلمان ہونے کا دعویٰ جو تم کرتے ہو اس میں کوئی غلطی ہے"۔ (خ ط' ص ۴۰)۔ مزید' جو قوم خدا کی کتاب رکھتی ہو اور پھر ذلیل و خوار اور محکوم و مغلوب ہو' تو سمجھ لیجیے کہ وہ ضرور کتاب الٰہی پر ظلم کر رہی ہے' اور اس پر یہ سارا وبال اسی ظلم کا ہے۔ خدا کے اس غضب سے نجات پانے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ اس کی کتاب کے ساتھ ظلم کرنا چھوڑ دیا جائے" (خ ط' ص ۴۹)۔ ہم حق کی شہادت دینے میں جتنی کوتاہی کرتے گئے' اور باطل کی شہادت ادا کرنے میں ہمارا قدم جس رفتار سے آگے بڑھا ہے' ٹھیک اسی رفتار سے ہم گرتے چلے گئے ہیں --- دنیا کی صفائی و اصلاح کے ذمے دار ہم تھے۔ ہم نے اپنا فرض منصبی ادا کرنا چھوڑ دیا تو دنیا خاردار جنگلوں سے بھر گئی' اور ان کا سب سے زیادہ پرخار حصہ ہمارے نصیب میں لکھا گیا (ن ز' ص ۳۴۵)۔

لیکن' اگر مسلمان قرآن کی دعوت پر لبیک کہیں اور اپنا فریضہ بحیثیت مسلمان ادا کریں' تو سید مودودی پورے یقین کے ساتھ انھیں یہ بشارت دیتے ہیں: "ایک وقت وہ آئے گا جب کمیونزم خود ماسکو میں اپنے بچاؤ کے لیے پریشان ہو گا [زمین بوس ہو گیا!]' سرمایہ دارانہ ڈیموکریسی خود واشنگٹن اور نیویارک میں اپنے تحفظ کے لیے لرزہ براندام ہو گی' --- اور یہ آج کا دور صرف تاریخ میں ایک داستان عبرت کی حیثیت سے باقی رہ جائے گا کہ اسلام جیسی عالم گیر و جہاں کشا طاقت کے نام لیوا بھی اتنے بے وقوف ہو گئے تھے کہ عصائے موسیٰ بغل میں تھا اور لاٹھیوں اور رسیوں کو دیکھ دیکھ کر کانپ رہے تھے (ن ز' ص ۳۴۵)۔

امت مسلمہ کی ترقی اور سربلندی کا کوئی نسخہ' ان کی نظر میں' ایمان اور عمل صالح کے ماسوا نہیں۔ "ایک قوم کو جو چیز زندہ اور طاقت ور اور سربلند بناتی ہے --- وہ اصول ہیں جن پر اس کی تہذیب

قائم ہوتی ہے' اور پھر ان اصولوں کا دلوں میں راسخ ہو جانا اور اعمال پر حکمراں بن جانا ہے" (ت ن ' ص ۲۴۳-۲۴۴)۔ اسی لیے' ترقی اور غلبے کے لیے "آپ تعجب کریں گے کہ قرآن نے کہیں یہ نہیں کہا کہ تم یونی ورسٹیاں بناؤ' کالج کھولو' کارخانے قائم کرو' کمپنیاں قائم کرو' بینک کھولو' سائنس کے آلات ایجاد کرو۔۔۔" (ت ن' ص ۲۴۶)۔ اگرچہ' وہ فوراً وضاحت کر دیتے ہیں کہ "اس کا یہ مطلب نہیں کہ علوم و فنون اور مادی ترقی کے وسائل کی جائز اہمیت سے انکار ہے۔ مطلب صرف یہ ہے کہ مسلمان قوم کے لیے یہ تمام چیزیں ثانوی درجے پر ہیں" (ت ن' ص ۲۴۸)۔

۹- دین میں انحراف و بگاڑ کا سب سے بنیادی سبب' سید مودودی کے نزدیک' عبادت اور دین کا زندگی کے چند گوشوں تک محدود ہو جانے' دین و سیاست کی تفریق' اور خلافت کے بالتدریج ملوکیت میں تبدیل ہونے کا عمل ہے اور احیائے ایمان کا لازمی نتیجہ اسلام کی ریاست مطلوب' مکمل اسلامی نظام حیات' اور اسلامی تہذیب کا قیام ہوگا۔ اس انحراف کو دور کرنے اور مطلوبہ نتیجہ حاصل کرنے کے لیے سید مودودی نے گراں قدر خدمات انجام دیں۔

انھوں نے اس تصور کو کہ اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے۔ آج کے زمانے میں مقبول عام بنا دیا: "اس کا تعلق انفرادی زندگی سے ہو یا اجتماعی زندگی سے' نماز' روزے اور حج و زکوۃ سے ہو یا معیشت و معاشرت اور تمدن و سیاست سے' اسلام کا کوئی حصہ بھی غیر ضروری نہیں ہے' پورے کا پورا اسلام ضروری ہے" (ل ع' ص ۳۹)۔ انھوں نے دین و سیاست کی تفریق کے تصور کو فکر کی سطح پر ختم کر دیا: "مسلمان اپنے ایمان کے تقاضے پورے نہیں کر سکتے جب تک وہ اسلامی معاشرہ اور اسلامی حکومت قائم نہ کر لیں"۔ اس لیے "خدا کے دین کے لیے حکومت کا طالب ہونا تو یہ دنیا پرستی نہیں بلکہ خدا پرستی ہی کا عین تقاضا ہے" (اد' ص ۵۶-۵۷)۔ یہ فکر بھی رائج عام ہوگئی۔ انھوں نے اسلامی ریاست کے خدوخال' اصول اور دستور کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا اور اس کے بگاڑ کے راستوں کی بھی نشان دہی کی (اسلامی ریاست اور خلافت و ملوکیت)۔

اسلامی ریاست کے ضمن میں انھوں نے تفصیل سے اور محکم استدلال کے ساتھ اسلام میں جمہوریت کا اثبات کیا: "خلیفہ بنانے کا وعدہ تمام مومنوں سے کیا گیا ہے۔ یہ نہیں کہا کہ ان میں سے کسی کو خلیفہ بناؤں گا۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ سب مومن خلافت کے حامل ہیں۔ یہ ہے اسلام میں جمہوریت کی بنیاد۔۔۔

"ایسی سوسائٹی میں کسی شخص یا گروہ کی ڈکٹیٹرشپ کے لیے کوئی گنجایش نہیں' اس لیے کہ یہاں ہر شخص خلیفہ ہے' کسی شخص یا گروہ کو یہ حق نہیں ہے کہ عام مسلمانوں سے ان کی خلافت کو سلب کر کے

خود حاکم مطلق بن جائے ۔ ایسی سوسائٹی میں ہر عاقل و بالغ مسلمان کو' خواہ وہ مرد ہو یا عورت' رائے دہی کا حق حاصل ہونا چاہیے' اس لیے کہ وہ خلافت کا حامل ہے" (اسلامی ریاست ۔ ا ر 'ص ۔ ۱۴۔ ۱۴۳ بحوالہ اسلام کا نظریہ سیاسی '۱۹۳۹)۔

"ریاست کے نظام کو چلانے کے لیے [مغربی جمہوریت] میں بھی عام رائے دہندوں کی رائے سے حکومت بنتی اور بدلتی ہے' اور ہماری جمہوریت بھی اسی کی متقاضی ہے" (ا ر 'ص ۔ ۳۲)۔

۔۱۔ ناقص ایمان اور اسلام کو پرائیویٹ زندگی میں چند مراسم تک محدود کر دینے کے نتیجے میں پیدا ہونے والے تناقضات پر سید مودودی نے بھرپور تنقید کی: "کیا اس [ایمان میں] نقص کی کسر ڈاڑھیوں کے طول اور لباس کی تراش خراش یا سبحہ گردانی یا تہجد خوانی سے پوری ہو سکتی ہے" (ت ذ 'ص ۲۲۸)۔ "اپنے کو مسلمان بھی کہنا' اور پھر قرآن و سنت کے مقابلے میں اپنے خیال یا دنیا کے دستور یا کسی انسان کے قول یا عمل کو ترجیح دینا' یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں"۔

لیکن یہ فتوے کی زبان نہیں 'نصیحت' موعظہ حسنہ اور جدال بالاحسن کی زبان ہے۔ اس لیے وہ ایک طرف یہ وضاحت کر دیتے ہیں کہ "میری ان باتوں کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ وضع قطع' لباس اور معاشرت کے ظاہری پہلوؤں کے متعلق جو آداب و احکام حدیث سے ثابت ہیں' میں ان کا استخفاف کرنا چاہتا ہوں' یا انھیں غیر ضروری قرار دیتا ہوں۔ خدا کی پناہ اس سے کہ میرے دل میں ایسا کوئی خیال ہو" (ت ذ 'ص ۲۴۷)۔ دوسری طرف وہ کہتے ہیں: "کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ میں مسلمانوں کو کافر بنانے چلا ہوں۔ نہیں' میرا یہ مقصد ہرگز نہیں" (خ ذ 'ص ۴۱)۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ تکفیر اور فرقہ واریت کے خلاف جتنا مضبوط بند انھوں نے باندھا اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔

اول' انھوں نے حقیقی اور قانونی اسلام میں امتیاز قائم کیا' جو اس فتنہ کی روک تھام کے لیے بہت بڑی خدمت ہے۔ انھوں نے کہا: ضروری ہے کہ اسلام کے زبانی "اقرار کے ساتھ جتنے لوگ مسلم سوسائٹی میں داخل ہوں وہ سب مسلمان مانے جائیں' ان میں سے کسی کی تکفیر نہ کی جائے" (خ ط 'ص ۳۔۱)۔ انھیں وہ حقوق دینے سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا جو ان کو مسلم سوسائٹی میں حاصل ہوں (ا ر 'ص ۴۵)۔

دوسرے انھوں نے تکفیر کے بارے میں یہ اہم اصول قائم کیا: "میں یہ بات قطعی جائز نہیں سمجھتا کہ ان لوگوں کو مشرک کہا جائے اور مشرکین کا معاملہ ان کے ساتھ کیا جائے' جو کلمہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کے قائل ہیں ۔ اور اس کے بعد تاویل کی غلطی کے باعث کسی مشرکانہ عقیدے اور عمل میں مبتلا ہو گئے ہیں' ہمیں ان پر کوئی بر القب چسپاں کرنے کے بجائے حکمت اور استدلال سے ان کی یہ غلط فہمی رفع کرنے کی کوشش کرنی چاہیے" (ر م 'ح ۳ 'ص ۵۹۴)

اسی لیے انھوں نے نصیحت کی کہ جو لوگ سب کی اصلاح کے لیے اٹھے ہوں وہ سب مسلمانوں کے ساتھ نماز پڑھیں اور ان کی خرابیوں کو ہمدردی اور محبت کے ساتھ دور کرنے کی کوشش کریں۔اس سلسلے میں انھوں نے ایک عام غلط فہمی کو دور کیا: ”رہا یہ اندیشہ کہ جس شخص کو آپ اپنے نزدیک گمراہی اور شرک میں مبتلا پاتے ہیں اس کی نماز چونکہ آپ کے عقیدے کے مطابق مقبول نہیں ہے' اس لیے اگر آپ اس کے پیچھے نماز پڑھیں گے تو آپ کی نماز نہ ہوگی' تو یہ اصلاً غلط ہے۔اول تو آپ یہ فیصلہ کرنے کے مجاز ہی نہیں ہیں کہ کس کی نماز مقبول ہوگی اور کس کی نہ ہوگی۔ایسے فیصلے کرنے کے بجائے زیادہ بہتر یہ ہے کہ آپ اپنی نماز کی مقبولیت کے لیے بھی دعا کریں اور دوسروں کی نماز کی مقبولیت کے لیے بھی۔دوسرے یہ کہ ہر فرد کی نماز انفرادی حیثیت ہی سے خدا کے حضور پیش ہوتی ہے' اور اگر وہ مقبول ہونے کے قابل ہو تو بہر حال مقبول ہو کر رہتی ہے' خواہ امام کی نماز مقبول ہو یا نہ ہو“۔(د م' ح ا' ص ۲۰۱-۲۰۲)

تیسرے' انھوں نے دین اور شریعت کے درمیان فرق قائم کیا' جس کو نہ سمجھنا تکفیر اور فرقہ واریت کی جڑ ہے۔ایک دین کا ماننا سب کے لیے ضروری ہے' مگر لوگ اپنی اپنی سمجھ کے مطابق شریعت پر چل سکتے ہیں۔خواہ ان کے عمل میں کتنا ہی فرق ہو' ان میں سے کوئی اسلام سے خارج نہ ہوگا۔--- جو دوسروں کو اپنی سمجھ کے ماننے پر مجبور کرتا ہے' اور نہ ماننے پر ان کی تکفیر کرتا ہے' وہ گویا کہتا ہے کہ ”صرف خدا ہی تمھارا خدا نہیں' بلکہ میں بھی چھوٹا خدا ہوں“ (خ ط' ص ۱۲۴-۱۲۵)۔

چوتھے' انھوں نے منصوص اور غیر منصوص کے درمیان فرق قائم کیا' اور صاف کہا کہ: ”اس اصول پر مجھے شدت سے اصرار ہے کہ آدمی صرف حکم منصوص کی خلاف ورزی سے ہی گناہ گار قرار پا سکتا ہے--- اسی طرح مجھے اس بات پر بھی اصرار ہے کہ حرام صرف وہ ہے جسے خدا اور رسولؐ نے بالفاظ صریح حرام کہا ہو' یا جس سے صاف الفاظ میں منع کیا ہو' یا جس میں مبتلا ہونے والے کو سزا کی وعید سنائی ہو' یا نصوص کے اشارات و اقتضاءات سے جن کی حرمت مستنبط ہونے پر اجماع ہو“۔ اجتہادی احکام کی خلاف ورزی کسی کو گناہ گار نہیں بناتی' اور اجتہاد سے حرام ٹھہرائی چیزیں' جن میں ایک سے زیادہ قول کی گنجائش ہو' مطلقاً حرام نہیں ہیں' سوائے اس شخص کے لیے جو اس اجتہاد کو صحیح تسلیم کرے (د م' ح ۲' ص ۱۷۲)۔

پانچویں انھوں نے منصوص و غیر منصوص اور مسنون و غیر مسنون کے درمیان فرق قائم کیا ”میرے نزدیک کسی غیر منصوص چیز کو منصوص کی طرح قرار دینا' اور کسی غیر مسنون چیز کو (جو اصطلاح شرعی کے لحاظ سے سنت نہ ہو) سنت قرار دینا' بدعت ہے اور ان خطرناک بدعتوں میں سے ہے جو

معلوم و معروف بدعتوں کی بہ نسبت زیادہ تحریف دین کی موجب ہوتی ہیں۔ اسی قبیل سے یہ ڈاڑھی کا معاملہ ہے۔ لوگوں نے غیر منصوص مقدار کو ایسی حیثیت دے دی ہے، اور اس پر ایسا اصرار کرتے ہیں جیسا کسی منصوص چیز پر ہونا چاہیے۔ پھر اس سے زیادہ خطرناک غلطی یہ کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت کو بعینہ وہ سنت قرار دیتے ہیں جس کو قائم و جاری کرنے کے لیے آپ مبعوث ہوئے تھے، درآں حالیکہ جو امور آپؐ نے عادتاً کیے ہیں، انھیں سنت بنا دینا، اور تمام دنیا کے انسانوں سے مطالبہ کرنا کہ وہ سب ان عادات کو اختیار کریں، اللہ اور اس کے رسولؐ کا ہرگز منشا نہ تھا" (ر م ج ۱، ص ۲۴۱)

۱۱- آخر میں ہم اجتہاد کے باب میں سید مودودی کی اہم مجتہدانہ خدمات کا ذکر ضروری سمجھتے ہیں، کہ یہ مستقبل کی نقشہ گری میں کلیدی حیثیت رکھتی ہیں۔

وہ اہمیت کے لحاظ سے مسلمانوں کے عروج و زوال کے اسباب میں اجتہاد کا مقام جہاد کے پہلو بہ پہلو رکھتے ہیں: "جب مسلمان تھک گئے، ان کی روح جہاد سرد پڑ گئی، قوت اجتہاد شل ہو گئی، تو ان کی ترقی کی رفتار رک گئی، اور وہ امامت کے منصب سے معزول ہو گئے۔ جہاد اور اجتہاد کا جھنڈا جس کو مسلمانوں نے پھینک دیا تھا، مغربی قوموں نے اٹھا لیا، وہ علم و عمل کے میدان میں آگے بڑھے، مسلمان سوتے رہے اور امامت کا منصب ان کو مل گیا (تنقیحات ـ ت ن، ص ۳۸-۳۹)۔

مسلمانوں کی ذہنی غلامی کی وجہ بھی ترک اجتہاد ہے: "مسلمان جب تک تحقیق و اجتہاد کے میدان میں آگے بڑھتے رہے تمام دنیا کی قومیں ان کی پیرو اور مقلد رہیں ... جب وہ اکتساب علم اور اجتہاد فکر کی راہ میں تھک کر بیٹھ گئے تو گویا انھوں نے خود دنیا کی راہ نمائی سے استعفیٰ دے دیا" (ت ن، ص ۸-۹)۔ نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان، مسلمان رہنا چاہتے ہیں، مگر ان کے دماغ مغربی تہذیب سے متاثر ہو کر اسلام سے منحرف ہو رہے ہیں۔

دوسرے، وہ اجتہاد کی نوعیت اور ضرورت کا تعین کرتے ہیں: یہ مشکل "اس وقت تک دور نہ ہوگی جب تک مسلمانوں میں آزاد اہل فکر نہ پیدا ہوں گے ... پرانے اسلامی محققین و مفکرین کا سرمایہ اب کام نہیں دے سکتا۔ دنیا اب آگے بڑھ چکی ہے۔ اس کو اب الٹے پاؤں ان منازل کی طرف واپس لے جانا ممکن نہیں جن سے وہ چھ سو سال پہلے گزر چکی ہے۔ علم و عمل کے میدان میں راہ نمائی وہی کر سکتا ہے، جو دنیا کو آگے کی جانب چلائے نہ کہ پیچھے کی جانب" (ت ن، ص ۲۰)۔

تیسرے، وہ اسلام کے علمی جمود کا تجزیہ کرتے ہیں: ہمارے اہل علم نے "الا ماشاء اللہ" اسلام کو ایک جامد اور غیر متحرک چیز بنا دیا ہے۔ غالباً چھٹی صدی ہجری کے بعد سے ان کے ہاں جنتری بدلنی بند ہو

گئی ہے - دنیا بدل کر کہیں سے کہیں پہنچ رہی ہے ' دنیا کے حالات ' خیالات ' رجحانات ' نظریات بدل کر کچھ سے کچھ ہو رہے ہیں' تمدن کے معاملات اور مسائل کتنے پلٹے کھا رہے ہیں' مگر یہ راہ نما ابھی تک ماضی میں رہتے ہیں' اسی فضا میں سوچتے ہیں' اسی کے مناسب حال باتیں کرتے ہیں - وہ ہر چیز کو ان کتابوں میں تلاش کرتے ہیں جو خدا کی کتابیں نہیں کہ زمانے کی قیود سے بالاتر ہوں - وہ ان انسانوں کی طرف رجوع کرتے ہیں جو خدا کے نبی نہیں کہ ان کی بصیرت اوقات اور حالات کی بندشوں سے آزاد ہو - پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ ایسے وقت میں مسلمانوں کی کامیاب راہ نمائی کر سکیں جب زمانہ بالکل بدلتا جا رہا ہے (ت د' ص ۴۱-۴۲-۱۸۱)

چوتھے ' وہ اس خرابی کی جڑ کا تعین کرتے ہیں: اصول ہاتھ سے چھوٹ گئے' فروع نے اصول کی جگہ لے لی' اور پھر ان سے ہزار در ہزار فروع نکل آئے جو اصل اسلام قرار پا گئے - ملت اسلامی اس ترتیب پر قائم تھی: پہلے قرآن مجید' پھر رسول اللہ ؐ' پھر اہل علم کا اجتہاد ... بدقسمتی سے اس ترتیب کو بالکل الٹ دیا گیا (ت د' ص ۱۸۲)-

پانچویں وہ انسانی اجتہاد کا مقام متعین کرتے ہیں: کسی انسان کا اجتہاد دنیا کے لیے دائمی اور اٹل قانون نہیں بن سکتا' کیونکہ اس کی عقل اور علم دونوں ہمیشہ زمانہ کی قیود سے مقید ہوتے ہیں (ت د' ص ۱۸۲)

چھٹے ' وہ آج کے چیلنج کا تعین کرتے ہیں: نئے نئے پیچیدہ علمی و عملی مسائل حل کیے جائیں' غالب مغربی تہذیب کے اصول و مبادی کو سمجھا جائے' ان کے علوم کا مطالعہ کیا جائے' ان کے کار آمد علمی اکتشافات اور عملی طریقوں کو اخذ کیا جائے' نئے کل پرزوں کو تمدنی زندگی میں اس طرح نصب کر دیا جائے کہ صدیوں کے جمود کے نقصان کی تلافی ہو جائے' اور اسلام کی گاڑی پھر سے زمانے کی رفتار کے ساتھ چلنے لگے (ت د' ص ۴۱)-

ساتویں' وہ جمود کو حرکت میں بدلنے کی تدبیر تجویز کرتے ہیں: صحیح تدبیر یہ نہیں ہے کہ فرنگیت اختیار کی جائے' اسلام کی قطع و برید شروع کر دی جائے' ائمہ مجتہدین کی عمارتوں کو ڈھا دیا جائے' حدیث کے سارے ذخیرے کو آگ میں پھونک دیا جائے' کلام الٰہی میں ترمیم و تنسیخ کی جائے - صحیح تدبیر صرف یہ ہے کہ جس ترتیب کو الٹ دیا گیا ہے اسے پھر سے سیدھا کر دیا جائے' قرآن و سنت کو پیشوا بنایا جائے' ائمہ سلف کی جن چیزوں کو بدلنے کی ضرورت نہیں انھیں بدستور رہنے دیا جائے' مگر یہ نہ سمجھا جائے کہ جو کچھ وہ لکھ گئے ہیں' اٹل قانون ہے (ت د' ص ۱۸۶-۱۸۷)

آٹھویں' وہ فقہ و تمدن کی طرح دعوت و اصلاح اور انقلاب اسلامی کی حکمت عملی کے دائرہ میں بھی اجتہاد کی ضرورت پر زور دیتے ہیں: کوئی بھی ایک تدبیر کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پکڑ کر نہیں بیٹھ سکتا -

اگر ایک وقت ایک تدبیر موزوں اور کارگر ہو اور دوسرے وقت نہ رہے، تو بلاتامل اس کو بدل دیں۔ جو شخص حالات اور مواقع و ذرائع کی تبدیلی کے ساتھ اصولوں پر عمل درآمد کی شکلیں نہ بدل سکے، وہ اس عطائی طبیب کی طرح ہے جو ایک نسخہ لے کر بیٹھ جائے اور آنکھیں بند کر کے تمام مریضوں پر اسے جوں کا توں استعمال کرتا چلا جائے (ت ع، ص ۵۹-۶۰، ۱۱۵-۱۱۷)۔

اسلام کی اصولی دعوت ایک ہی ہے، لیکن تمام معاشرے ایک جیسے نہیں ہوتے، اور یہ بھی ضروری نہیں کہ حالات بعینہ وہی ہوں جو کسی نبی کے عہد میں تھے۔ اس لیے اسلام کے لیے کام کرنے والا وقت اور مقام کے حالات دیکھے اور سمجھے، اور ایسا طریق کار اختیار کرے جو ان حالات میں مناسب ترین ہو (ر د، ج ۵، ص ۲۲۶-۲۲۷)

اس سلسلے میں وہ جمود کے اصل سبب پر انگلی رکھ دیتے ہیں: ”اصل رہنما اور حقیقی مصلح [جیسے سید مودودی تھے] اجتہاد و فکر سے کام لیتا ہے اور وقت اور موقع کے لحاظ سے جو مناسب تدبیر ہوتی ہے اسے اختیار کرتا ہے۔ اس کے بعد جو لوگ اس کا اتباع کرتے ہیں وہ اندھے مقلد ہوتے ہیں۔ جس طریقے کو اس نے وقت کے لحاظ سے اختیار کیا تھا اس طریقے پر یہ اس وقت کے گزر جانے کے بعد بھی آنکھیں بند کر کے چلے جاتے ہیں، اور اتنا نہیں سوچتے کہ ماضی میں جو انسب تھا حال میں وہی انسب ہے۔ پچھلی صدی کے راہنماؤں کے بعد، ان کے متبعین آج بھی اسی روش پر اصرار کر رہے ہیں جس پر ان کے راہنما انھیں چھوڑ گئے تھے، حالانکہ وہ وقت جس کے لیے انھوں نے وہ روش اختیار کی تھی گزر چکا ہے۔ اب اجتہاد و فکر سے کام لے کر نیا طریقہ اختیار کرنے کی ضرورت ہے“ (ت ن، ص ۱۷۰)۔

آج کی ضرورت، آج کا چیلنج یہی ہے۔ سید مودودی نے اپنی فکری خدمات پر ”فکر مودودی“ کی چھاپ لگنے کی شدت سے روک تھام کی، اور ان کو معیار حق ماننے کا کسی کو پابند نہیں کیا، تو صرف اس لیے کہ ”راہ خدا میں ان کے ہم سفر“ آنکھیں بند کر کے نہ چلیں۔ آج ان کی فکر کے صحیح وارث وہی ہو سکتے ہیں جو، ان کی فکری خدمات کی روشنی میں، اجتہاد و فکر سے کام لیں، ماضی کے اسیر نہ ہوں، حال کے مناسب طریقے اختیار کریں، اور مستقبل کے نقیب بنیں، ٹھیک جس طرح انھوں نے اپنے زمانے میں کیا۔

اپنے گھروں کو قبلہ بنا لو

واجعلوا بیوتکم قبلہ (یونس ۱۰۔ ۸۷)

بنی اسرائیل کو یہ ہدایت آج ہمارے لیے ہے

فساد کی لہریں گھروں کے دروازوں تک --- نہیں

-- اندر داخل ہو چکی ہیں۔

مقابلہ گھروں کے مورچوں سے ہی ہوتا ہے۔

ہر بچہ فطرت سلیم پر پیدا ہوتا ہے۔

اس کی فطرت مسخ نہ ہونے دیں۔

یہ کام ارادہ اور شعوری کوشش کا تقاضا کرتا ہے۔

فساد میں ہرگز معاون نہ بنیں۔

گھر کی فضا دینی ہو' اس کا کلچر اسلام کا کلچر ہو'

آنے والی تبدیلی کے لیے گھر کو مرکز و محور اور قبلہ بنا دیں۔

یہ نہ بھولیے

اس سلطنت کی رعایا کے لیے آپ مسئول بھی ہیں!

داعی کی صفات

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ـ وَإِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ إِنَّهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ـ إِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَإِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ ـ (الاعراف ۷: ۱۹۹-۲۰۱)

اے نبیؐ! نرمی و درگزر کا طریقہ اختیار کرو، معروف کی تلقین کیے جاؤ، اور جاہلوں سے نہ الجھو۔ اگر کبھی شیطان تمھیں اکسائے تو اللہ کی پناہ مانگو، وہ سننے اور جاننے والا ہے۔ حقیقت میں جو لوگ متقی ہیں ان کا حال تو یہ ہوتا ہے کہ کبھی شیطان کے اثر سے کوئی برا خیال اگر انھیں چھو بھی جاتا ہے تو وہ فوراً چوکنے ہو جاتے ہیں اور پھر انھیں صاف نظر آنے لگتا ہے کہ ان کے لیے صحیح طریق کار کیا ہے۔

ان آیات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت و تبلیغ اور ہدایت و اصلاح کی حکمت کے چند اہم نکات بتائے گئے ہیں اور مقصود صرف حضورؐ ہی کو تعلیم دینا نہیں ہے بلکہ حضورؐ کے ذریعے سے ان سب لوگوں کو یہی حکمت سکھانا ہے جو حضورؐ کے قائم مقام بن کر دنیا کو سیدھی راہ دکھانے کے لیے اٹھیں۔ ان نکات کو سلسلہ وار دیکھنا چاہیے:

۱۔ داعیِ حق کے لیے جو صفات سب سے زیادہ ضروری ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ اسے نرم خُو، متحمل اور عالی ظرف ہونا چاہیے۔ اس کو اپنے ساتھیوں کے لیے شفیق، عامۃ الناس کے لیے رحیم اور اپنے مخالفوں کے لیے حلیم ہونا چاہیے۔ اس کو اپنے رفقا کی کمزوریوں کو بھی برداشت کرنا چاہیے اور اپنے مخالفین کی سختیوں کو بھی۔ اسے شدید سے شدید اشتعال انگیز مواقع پر بھی اپنے مزاج کو ٹھنڈا رکھنا چاہیے، نہایت ناگوار باتوں کو بھی عالی ظرفی کے ساتھ ٹال دینا چاہیے، مخالفوں کی طرف سے کیسی ہی سخت کلامی، بہتان تراشی، ایذا رسانی اور شریرانہ مزاحمت کا اظہار ہو، اس کو درگزر ہی سے کام لینا چاہیے۔ سخت گیری، درشت خوئی، تلخ گفتاری، اور منتقمانہ اشتعالِ طبع اس کام کے لیے زہر کا حکم رکھتا

ہے اور اس سے کام بگڑتا ہے' بنتا نہیں ہے۔ اسی چیز کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں بیان فرمایا ہے کہ میرے رب نے مجھے حکم دیا ہے کہ "غضب اور رضا' دونوں حالتوں میں انصاف کی بات کہوں' جو مجھ سے کٹے میں اس سے جڑوں' جو مجھے میرے حق سے محروم کرے' میں اسے اس کا حق دوں' جو میرے ساتھ ظلم کرے میں اس کو معاف کر دوں"۔ اور اسی چیز کی ہدایت آپ ان لوگوں کو کرتے تھے جنھیں آپ دین کے کام پر اپنی طرف سے بھیجتے تھے کہ بشروا ولا تنفروا ویسروا ولا تعسروا 'یعنی جہاں تم جاؤ وہاں تمھاری آمد لوگوں کے لیے مژدہ جانفزا ہو نہ کہ باعث نفرت' اور لوگوں کے لیے تم سہولت کے موجب بنو نہ کہ تنگی و سختی کے۔ اور اسی چیز کی تعریف اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں فرمائی ہے کہ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ یعنی یہ اللہ کی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لیے نرم ہو ورنہ اگر تم درشت خو اور سنگ دل ہوتے تو یہ سب لوگ تمھارے گردوپیش سے چھٹ جاتے۔ (آل عمران ۳: ۱۵۹)

۲۔ دعوت حق کی کامیابی کا گر یہ ہے کہ آدمی فلسفہ طرازی اور دقیقہ سنجی کے بجائے لوگوں کو معروف یعنی ان سیدھی اور صاف بھلائیوں کی تلقین کرے جنھیں بالعموم سارے ہی انسان بھلا جانتے ہیں یا جن کی بھلائی کو سمجھنے کے لیے وہ عقل عام (common sense) کافی ہوتی ہے جو ہر انسان کو حاصل ہے۔ اس طرح داعی حق کی اپیل عوام و خواص سب کو متاثر کرتی ہے اور ہر سامع کے کان سے دل تک پہنچنے کی راہ آپ نکال لیتی ہے۔ ایسی معروف دعوت کے خلاف جو لوگ شورش برپا کرتے ہیں وہ خود اپنی ناکامی اور اس دعوت کی کامیابی کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ کیونکہ عام انسان' خواہ وہ کتنے ہی تعصبات میں مبتلا ہوں' جب یہ دیکھتے ہیں کہ ایک طرف ایک شریف النفس اور بلند اخلاق انسان ہے جو سیدھی سیدھی بھلائیوں کی دعوت دے رہا ہے اور دوسری طرف بہت سے لوگ اس کی مخالفت میں ہر قسم کی اخلاق و انسانیت سے گری ہوئی تدبیریں استعمال کر رہے ہیں' تو رفتہ رفتہ ان کے دل خود بخود مخالفین حق سے پھرتے اور داعی حق کی طرف متوجہ ہوتے چلے جاتے ہیں' یہاں تک کہ آخر کار میدان مقابلہ میں صرف وہ لوگ رہ جاتے ہیں جن کے ذاتی مفاد نظام باطل کے قیام ہی سے وابستہ ہوں' یا پھر جن کے دلوں میں تقلید اسلاف اور جاہلانہ تعصبات نے کسی روشنی کے قبول کرنے کی صلاحیت باقی ہی نہ چھوڑی ہو۔ یہی وہ حکمت تھی جس کی بدولت نبیؐ کو عرب میں کامیابی حاصل ہوئی اور پھر آپ کے بعد تھوڑی ہی مدت میں اسلام کا سیلاب قریب کے ملکوں پر اس طرح پھیل گیا کہ کہیں سو فی صدی اور کہیں ۸۰ اور ۹۰ فی صدی باشندے مسلمان ہو گئے۔

۳۔ اس دعوت کے کام میں جہاں یہ بات ضروری ہے کہ طالبین خیر کو معروف کی تلقین کی جائے

وہاں یہ بات بھی اتنی ہی ضروری ہے کہ جاہلوں سے نہ الجھا جائے خواہ وہ الجھنے اور الجھانے کی کتنی ہی کوشش کریں۔ داعی کو اس معاملے میں سخت محتاط ہونا چاہیے کہ اس کا خطاب صرف ان لوگوں سے رہے جو معقولیت کے ساتھ بات کو سمجھنے کے لیے تیار ہوں اور جب کوئی شخص جہالت پر اتر آئے اور حجت بازی، جھگڑالو پن اور طعن و تشنیع شروع کر دے تو داعی کو اس کا حریف بننے سے انکار کر دینا چاہیے۔ اس لیے کہ اس جھگڑے میں الجھنے کا حاصل کچھ نہیں ہے اور نقصان یہ ہے کہ داعی کی جس قوت کو اشاعت دعوت اور اصلاح نفوس میں خرچ ہونا چاہیے وہ اس فضول کام میں ضائع ہو جاتی ہے۔

۴۔ نمبر ۳ میں جو ہدایت کی گئی ہے، اسی کے سلسلے میں مزید ہدایت یہ ہے کہ جب کبھی داعی حق مخالفین کے ظلم اور ان کی شرارتوں اور ان کے جاہلانہ اعتراضات و الزامات پر اپنی طبیعت میں اشتعال محسوس کرے تو اسے فوراً سمجھ لینا چاہیے کہ یہ نزغ شیطانی (یعنی شیطان کی اکساہٹ) ہے اور اسی وقت خدا سے پناہ مانگنی چاہیے کہ اپنے بندے کو اس جوش میں بہ نکلنے سے بچائے اور ایسا بے قابو نہ ہونے دے کہ اس سے دعوت حق کو نقصان پہنچانے والی کوئی حرکت سرزد ہو جائے۔ دعوت حق کا کام بہرحال ٹھنڈے دل سے ہی ہو سکتا ہے اور وہی قدم صحیح اٹھ سکتا ہے جو جذبات سے مغلوب ہو کر نہیں بلکہ موقع و محل کو دیکھ کر، خوب سوچ سمجھ کر اٹھایا جائے۔ لیکن شیطان، جو اس کام کو فروغ پاتے ہوئے کبھی نہیں دیکھ سکتا، ہمیشہ اس کوشش میں لگا رہتا ہے کہ اپنے بھائی بندوں سے داعی حق پر طرح طرح کے حملے کرائے، اور پھر ہر حملے پر داعی حق کو اکسائے کہ اس حملے کا جواب تو ضرور ہونا چاہیے۔ یہ اپیل جو شیطان داعی کے نفس سے کرتا ہے، اکثر بڑی بڑی پرفریب تاویلوں اور مذہبی اصطلاحوں کے غلاف میں لپٹی ہوئی ہوتی ہے، لیکن اس کی تہ میں بجز نفسانیت کے اور کوئی چیز نہیں ہوتی۔ اسی لیے آخری دو آیتوں میں فرمایا کہ جو لوگ متقی (یعنی خدا ترس اور بدی سے بچنے کے خواہشمند) ہیں وہ تو اپنے نفس میں کسی شیطانی تحریک کا اثر اور کسی برے خیال کی کھٹک محسوس کرتے ہی فوراً چوکنے ہو جاتے ہیں اور پھر انھیں صاف نظر آ جاتا ہے کہ اس موقع پر دعوت دین کا مفاد کس طرز عمل کے اختیار کرنے میں ہے اور حق پرستی کا تقاضا کیا ہے۔ رہے وہ لوگ جن کے کام میں نفسانیت کی لاگ لگی ہوئی ہے اور اس وجہ سے جن کا شیاطین کے ساتھ بھائی چارے کا تعلق ہے، تو وہ شیطانی تحریک کے مقابلے میں نہیں ٹھہر سکتے اور اس سے مغلوب ہو کر غلط راہ پر چل نکلتے ہیں۔ پھر جس جس وادی میں شیطان چاہتا ہے انھیں لیے پھرتا ہے اور کہیں جا کر ان کے قدم نہیں رکتے۔ مخالف کی ہر گالی کے جواب میں ان کے پاس گالی اور ہر چال کے جواب میں اس سے بڑھ کر چال موجود ہوتی ہے۔

اس ارشاد کا ایک عمومی محل بھی ہے اور وہ یہ کہ اہل تقویٰ کا طریقہ بالعموم اپنی زندگی میں غیر متقی لوگوں سے مختلف ہوتا ہے۔ جو لوگ حقیقت میں خدا سے ڈرنے والے ہیں اور دل سے چاہتے ہیں کہ برائی سے بچیں ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ برے خیال کا ایک ذرا سا غبار بھی اگر ان کے دل کو چھو جاتا ہے تو انھیں ویسی ہی کھٹک محسوس ہونے لگتی ہے جیسی کھٹک انگلی میں پھانس چبھ جانے یا آنکھ میں کسی ذرے کے گر جانے سے محسوس ہوتی ہے۔ چونکہ وہ برے خیالات' بری خواہشات اور بری نیتوں کے خوگر نہیں ہوتے اس وجہ سے یہ چیزیں ان کے لیے اسی طرح خلاف مزاج ہوتی ہیں جس طرح انگلی کے لیے پھانس یا آنکھ کے لیے ذرہ یا ایک نفیس طبع اور صفائی پسند آدمی کے لیے کپڑوں پر سیاہی کا ایک داغ یا گندگی کی ایک چھینٹ۔ پھر جب یہ کھٹک انھیں محسوس ہو جاتی ہے تو ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ اور ان کا ضمیر بیدار ہو کر اس غبار شر کو اپنے اوپر سے جھاڑ دینے میں لگ جاتا ہے۔ بخلاف اس کے جو لوگ نہ خدا سے ڈرتے ہیں' نہ بدی سے بچنا چاہتے ہیں اور جن کی شیطان سے لاگ لگی ہوئی ہے' ان کے نفس میں برے خیالات' برے ارادے' برے مقاصد پکتے رہتے ہیں اور وہ ان گندی چیزوں سے کوئی اجنبیت اپنے اندر محسوس نہیں کرتے' بالکل اسی طرح جیسے کسی دیگچی میں سور کا گوشت پک رہا ہو اور وہ بے خبر ہو کہ اس کے اندر کیا پک رہا ہے' یا جیسے کسی بھنگی کا جسم اور اس کے کپڑے غلاظت میں لتھڑے ہوئے ہوں اور اسے کچھ احساس نہ ہو کہ وہ کن چیزوں میں آلودہ ہے۔ (تفہیم القرآن' ج ۲' ص ۱۱۰-۱۱۳)

فیصلہ قضایا کے بنیادی اصول

عدالتی طریقِ کار اور پالیسی

ڈاکٹر محمود احمد غازی

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ مشہور اور جلیل القدر صحابی ہیں۔ اصل اسم گرامی عبداللہ بن قیسؓ ہے۔ رہنے والے یمن کے تھے۔ اسلام کے ابتدائی دور میں ہی ایمان لے آئے تھے اور مکہ مکرمہ ہی میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آ چکے تھے۔ آپ نے حبشہ بھی ہجرت فرمائی تھی۔ ہجرت مدینہ کے بعد قریب قریب تمام غزوات و مہمات میں شرکت کی۔ ۹ھ میں حضورؐ نے آپ کو یمن کے علاقوں: زبید اور عدن کا گورنر مقرر فرمایا۔ ۱۷ھ میں حضرت عمر فاروقؓ نے آپ کو بصرہ کا گورنر اور صدر قاضی مقرر کیا۔ اس حیثیت میں آپ نے بہت سے تاریخی کارنامے انجام دیے۔ حضرت عمرؓ کو اپنے جن حکام و قضاۃ پر بہت گہرا اعتماد تھا، ان میں سے ایک حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ بھی تھے۔ حضرت عمرؓ ان کو وقتاً فوقتاً خطوط اور مراسلے لکھتے رہتے تھے، جن میں سے بعض کا ذکر حدیث اور تاریخ کی کتابوں میں ملتا ہے۔ چند ایک کا متن بھی محدثین و مورخین نے محفوظ رکھا ہے۔ خود حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کا طریقہ تھا کہ حضرت عمرؓ کے ان تمام خطوط کی نقلیں محفوظ رکھا کرتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کی وصیت کے مطابق یہ قیمتی ذخیرہ ان کے صاحبزادے حضرت ابوبردہؓ کو مل گیا۔ وہ ان خطوط کی روایت بھی کیا کرتے تھے اور مشتاقانِ علم کو ان کی نقلیں بھی دے دیا کرتے تھے۔ سفیان بن عیینہ (مشہور محدث م ۱۹۸ھ) بیان کرتے ہیں: ابوعبداللہ بن ادریس، ابوبردہؓ کے صاحبزادے سعید بن ابی بردہ کے ہاں گئے، اور ان سے خواہش ظاہر کی کہ مجھے وہ خطوط دکھا دیں جو حضرت عمرؓ نے آپ کے دادا حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو لکھے تھے۔ سعید بن ابی بردہ بہت سے خطوط نکال لائے۔ ان میں ایک اہم خط قضایا کے فیصلوں کے لیے عدالتی طریق کے اصولوں کے بارے میں تھا۔ اس تحریری شہادت کے علاوہ تابعین کی ایک بڑی تعداد نے اس خط کی زبانی روایت بھی کی ہے۔

ذیل میں یہ تاریخی دستاویز اور اس کے اہم مباحث کی، حافظ ابن قیمؒ کی مفصل شرح سے ماخوذ تلخیص

پیش کی جا رہی ہے۔ یہ اصول صرف عدالتی قضایا ہی کے لیے نہیں بلکہ گھریلو' معاشرتی' بین الانسانی اور تمام اجتماعی تعلقات اور قضایا کے لیے انتہائی قیمتی راہ نمائی فراہم کرتے ہیں۔ (مدیر)

(۱) جب کوئی مقدمہ تمہارے سامنے پیش ہو تو تم اس کو اچھی طرح سمجھ لو

جاننا چاہیے کہ کوئی مفتی یا حاکم عدالت اس وقت تک نہ تو حق کے مطابق فیصلہ دے سکتا ہے اور نہ فتویٰ جاری کر سکتا ہے' جب تک اس کو فہم صحیح کی نعمت سے نہ نوازا جائے۔ فہم صحیح اور نیک نیتی' یہ دو اللہ تعالیٰ کی جلیل القدر اور عظیم الشان نعمتیں ہیں۔ صحیح اسلام کی بنیاد یہی دونوں چیزیں ہیں اور اسلام کی اساس ان دونوں پر ہی قائم ہے۔

۱- سب سے پہلے تو اس واقعہ کی' جو پیش آیا ہے' صحیح سمجھ۔ یہ سمجھ قرائن' علامات اور دوسری نشانیوں پر غور کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔

۲- دوسرے اس بات کی سمجھ کہ اس پیش آمدہ واقعہ میں کیا کرنا چاہیے' یعنی اس معاملے میں وہ حکم شرعی کیا ہے جو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ؐ سے معلوم ہوتا ہے۔

اس کے بعد ان دونوں کو ایک دوسرے پر منطبق کرنے کا مرحلہ آتا ہے۔ اب جو شخص بھی اس معاملے میں مقدور بھر کوشش کرے گا' اور اپنی تمام صلاحیتوں کو اس میں بروئے کار لائے گا' وہ ایک یا دوگنے اجر کا ضرور مستحق ہو گا۔ حقیقی عالم وہی ہے جو واقعہ کا صحیح فہم حاصل کر کے اس میں غور و فکر کرے' اور اس کے ذریعے اس کو اللہ اور اس کے رسول ؐ کا حکم بھی پتا چل جائے۔ بالکل اس طرح جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں گواہ نے ان کی قمیض پیچھے سے پھٹی ہوئی دیکھ کر فوراً یہ پتا لگا لیا کہ حضرت یوسف بالکل بری اور پاک دامن ہیں' اور اپنے بیان میں سچے ہیں۔ یا جس طرح حضرت سلیمان علیہ السلام نے' یہ کہہ کر کہ چھری لاؤ' میں اس بچے کو کاٹ کر تم دونوں میں تقسیم کر دوں' بچے کی دعوے دار دونوں عورتوں میں سے اس کی اصلی ماں کو پہچان لیا۔ یا جس طرح حضرت علی ؓ نے اس عورت سے' جو حاطب بن ابی بلتعہ ؓ کا خط لے کر جا رہی تھی' یہ کہہ کر خط برآمد کرا لیا کہ اگر تو نے خط نکال کر نہ دیا تو ہم تجھے برہنہ کر کے تیری تلاشی لیں گے۔

جو شخص بھی شریعت کے احکام اور صحابہ کرام ؓ کے فیصلوں کا بغور مطالعہ کرے گا' اس کو جابجا یہی نکتہ کارفرما ملے گا۔ لیکن جو شخص اس نکتہ کو سمجھے بغیر یہ کام کرے گا' وہ لوگوں کے حقوق بھی ضائع کرے گا' اور شریعت کو بھی بدنام کرے گا' اور اس کی طرف غلط باتیں بھی منسوب ہوں گی۔

۲- جو حق نافذ نہ کیا جا سکے اس کے بارے میں باتیں بنانے سے کچھ حاصل نہیں

حضرت عمر ؓ کا مقصود یہاں حق کے نفاذ کی اہمیت ظاہر کرنا ہے۔ اگر حاکم عدالت کسی کے حق کو

تسلیم تو کرے، لیکن یا تو اس کو نافذ نہ کرے یا نافذ کرنے کی اس میں قدرت و اہلیت نہ ہو، تو پھر محض زبانی اس کو تسلیم کرنا بے کار ہے۔ حق دار کو اس تسلیم کرنے سے آخر کیا فائدہ ہو گا؟

۳۔ اپنی نشست و برخواست اور چہرے کے تاثرات تک میں لوگوں کے درمیان برابری اور مساوات قائم رکھو تاکہ کوئی بااثر آدمی یہ غلط امید نہ رکھے کہ تم سے کسی کے خلاف کوئی زیادتی کرالے گا، اور کوئی کمزور شخص اس سے مایوس نہ ہو کہ اس کو تمہارے ہاں سے عدل و انصاف ملے گا۔ اور اسی طرح کوئی کمزور شخص تمہاری سختی سے خوفزدہ نہ ہو۔

۴۔ بار ثبوت مدعی کے ذمہ ہے اور قسم اس شخص کی ذمہ داری ہے جو دعوی کی صحت سے انکار کر رہا ہو

قرآن مجید، احادیث اور صحابہ کرام کے اقوال میں جہاں بینة کا استعمال ہوا ہے، اس سے مراد ہر وہ چیز ہے جو حق کو پورے طور پر واضح اور ثابت کر دے۔ مثال کے طور پر: لقد ارسلنا رسلنا بالبینات 'ہم نے اپنے رسولوں کو واضح اور کھلی نشانیاں دے کر بھیجا ہے۔ قرآن مجید میں کسی بھی آیت میں بینة کا لفظ گواہوں کے معنی میں استعمال نہیں ہوا۔ لہٰذا جب بھی ہم حدیث میں پڑھتے ہیں کہ رسول اللہ ؐ نے مدعی سے پوچھا کہ کیا تمہارے پاس بینہ ہے' یا اس خط میں حضرت عمرؓ نے لکھا کہ بینہ مدعی کے ذمہ ہے' تو ان سب جگہ بینہ سے مراد ہے۔ وہ واضح اور حتمی ثبوت جس سے کسی دعویٰ یا بیان کی صداقت واضح ہو جائے۔ لہٰذا اس لفظ کے عمومی معنی اور مفہوم کو گواہوں کی طے شدہ تعداد سے محدود کرنا صحیح نہیں۔ گواہی بھی بینہ کی بہت سی اقسام میں سے ایک ہے۔ بینہ کے ان بہت سے معانی کو ختم کر کے صرف گواہی کے معنی لینے کے بڑے خطرناک نتائج نکلتے ہیں' اور بہت سے حقداروں کی حق تلفی ہوتی ہے۔ ہر معاملے میں گواہوں پر اصرار کرنے اور دیگر ذرائع ثبوت کو نظرانداز کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ بہت سے ظالم اور حق ناشناس لوگوں کو صرف اس وجہ سے کھیل کھیلنے کا موقع ملا کہ ان کو یقین تھا کہ ان کی حرکت کی گواہی دینے والے دو گواہ دستیاب نہ ہوں گے۔ اگر بینہ کے قرآنی معنی و مفہوم کو سامنے رکھا جاتا تو یہ صورت پیدا نہ ہوتی۔

۵۔ لوگوں (مسلمانوں) کے درمیان ہر قسم کی صلح، مصالحت یا راضی نامہ جائز ہے، سوائے اس صلح یا راضی نامہ کے، جو کسی حرام کو حلال کر دے یا کسی حلال کو حرام کر دے۔

یہی بات رسول اللہ ؐ نے بھی بیان فرمائی ہے۔ انھی الفاظ میں' ایک دوسرے جملے کے اضافے

کے ساتھ ..... مسلمانوں کے درمیان جو بھی شرائط طے ہوں وہ باقی رکھی جائیں گی ۔ سوائے ان شرائط کے جو کسی حلال کو حرام یا کسی حرام کو حلال کر دیں ---- یہ حدیث ترمذی اور دوسرے محدثین نے حضرت عمرو بن عوف ؓ المزنی کے حوالے سے روایت کی ہے ۔

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے درمیان ہر قسم کی صلح اور مصالحت کو پسندیدہ قرار دیا ہے ۔ قرآن مجید میں بین الاقوامی معاملات سے لے کر گھریلو اختلافات تک تمام مسائل کو صلح صفائی سے حل کرنے کی ترغیب دلائی گئی ہے ۔ رسول اللہ ؐ نے بارہا صحابہ کرام ؓ کے درمیان پیدا ہو جانے والے اختلافات کو صلح اور راضی نامہ سے طے کرایا ۔

اسلامی شریعت میں حقوق کی بنیادی طور پر دو قسمیں ہیں: ۱ ۔ حقوق اللہ ' ۲ ۔ حقوق العباد ۔ حقوق اللہ میں کسی قسم کی صلح یا راضی نامہ کی گنجایش نہیں ۔ مثلاً حدود کا نفاذ ' زکوۃ کی ادائگی اور کفارہ کی ادائگی وغیرہ میں کوئی مصالحت نہیں ہو سکتی ۔ ان معاملات میں بندہ اگر اللہ تعالیٰ سے صلح کرنا چاہتا ہے تو اس کا طریقہ صرف یہ ہے کہ ان حقوق کی انجام دہی میں پوری پوری کوشش کرے ' اور کسی قسم کی کوتاہی نہ ہونے دے ۔ یہی وجہ ہے کہ جب حدود کے مقدمات عدالت میں دائر ہو جائیں یا حکام (مثلاً پولیس) کے نوٹس میں آجائیں ' تو پھر سفارش کرنے والے اور سفارش سننے والے دونوں پر خدا کی لعنت ۔

اس کے برعکس حقوق العباد میں صلح کی بھی گنجایش ہے ' ایک شخص اپنا حق معاف بھی کر سکتا ہے ' اور اس کا کوئی معاوضہ بھی لے سکتا ہے ' لیکن مصالحت ایسی ہونی چاہیے جو عادلانہ ہو ' انصاف پر مبنی ہو ' ظلم و زیادتی پر مبنی نہ ہو ' خود قرآن مجید کہتا ہے: فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ ' ان دونوں کے درمیان عدل و انصاف کے مطابق صلح کرا دو ۔ لیکن اگر یہ مصالحت غیر منصفانہ ہو ' تو پھر وہ سراسر ظلم ہو گی ۔

بعض اوقات لوگ مصالحت کرتے وقت ایسی شرائط رکھ دیتے ہیں جن کا اثر شریعت کے مقرر کردہ حلال و حرام پر بھی پڑتا ہے ۔ مثلاً جن کی بنیاد سود خوری یا کسی حد شرعی کی موقوفی یا ایسی ہی کسی چیز پر ہوتی ہے ۔ اس قسم کی ہر شرط ظالمانہ سمجھی جائے گی ' اور مسترد کر دی جائے گی ۔ جائز صلح کے معنی یہ ہیں کہ اس میں ایسی شرائط ہوں جن سے اللہ کی رضا بھی حاصل ہو اور بندے بھی خوش ہو جائیں ۔ جو شخص یہ صلح کرائے ' اس کے لیے ضروری ہے کہ اس کو واقعہ زیر بحث کی تمام تفصیلات کا علم ہو ' ایسے واقعہ میں کیا کرنا چاہیے اس کو جانتا ہو ' اور عدل و انصاف کے تقاضے پورے کرنے کا ارادہ رکھتا ہو ۔ اگر یہ سب صفات اس شخص میں موجود ہوں ' تو ایک حدیث مبارک میں رسول اللہ ؐ نے ایسے ہی صلح کرانے والے کو دن روزہ دار و شب زندہ دار سے بہتر قرار دیا ہے ۔

۶۔ اگر تم نے کل کوئی فیصلہ کیا ھے اور آج تم نے اس پر دوبارہ غور وفکر کیا ھے ، اور تم کو راہ راست کی طرف راہ نمائی حاصل ہو گئی ھے ، تو محض یہ بات کہ تم ایک فیصلہ کر چکے ہو ، تمھیں ہرگز ہرگز حق کی طرف رجوع کرنے سے باز نہ رکھے ، اس لیے کہ یاد رکھو حق ایک اٹل حقیقت ھے ، اس کو کوئی دوسری چیز باطل یا غلط نہیں ٹھہرا سکتی ، اور یاد رکھو کہ باطل پر اڑے رہنے سے کہیں بہتر ھے کہ حق کی طرف رجوع کر لیا جائے ۔

یعنی اگر حاکم عدالت اپنے اجتہاد کی روشنی میں آج کوئی فیصلہ کرتا ہے اور کل مزید غور و فکر کرنے سے یا مزید مطالعہ کرنے سے یا کچھ اور نئی معلومات و حقائق سامنے آنے سے وہ اپنی رائے بدل لیتا ہے ' تو اس کو دوسری رائے پر عمل کرنے میں کسی جھجک ' خوف یا شرم کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے ۔ مسلمان کی شان ہی یہ ہے کہ جوں ہی اس کو حق کا علم ہو فوراً اس کی طرف پیش قدمی کرتا ہے ۔ اور سابقہ تمام تعصبات کو جھٹک کر پھینک دیتا ہے ۔ ایسے ہی ایک موقع پر خود حضرت عمرؓ نے ایک ملتے جلتے معاملے میں بعد میں جو فیصلہ کیا ' وہ ان کے ایک سابقہ فیصلے سے مختلف تھا ۔ اس پر ایک شخص نے کہا : آپ نے فلاں فلاں موقع پر تو یہ فیصلہ نہیں کیا تھا ؟ حضرت عمرؓ نے جواب دیا : تلک علی ما قضینا یومئذ ، وھذہ علی ما قضینا الیوم ' وہ معاملہ اس طرح طے ہوا جیسے ہم نے اس وقت فیصلہ کیا تھا ' اور یہ معاملہ ایسے طے ہو گا جیسے ہم آج فیصلہ کر رہے ہیں ۔ اس طرح حضرت عمرؓ نے سابقہ فیصلے کو بھی بحال رکھا لیکن اس کو دوسرے فیصلے کی راہ میں رکاوٹ نہیں بننے دیا ۔

۷۔ جن معاملات میں قرآن و سنت کی کوئی ھدایت موجود نہیں ، اور تمھارے دل میں کھٹکتے ھیں ، ان کے بارے میں خوب غور وفکر اور سمجھ سے کام لو ، ایسے نئے نئے مسائل حل کرنے کے لیے تم پہلے قرآن و سنت میں موجود ملتے جلتے مسائل اور اصولوں سے واقفیت حاصل کرو اور پھر نئے معاملات کو ان اصولوں پر قیاس کر لو ، اس کے بعد جو حل تمھاری رائے میں اللہ کو زیادہ محبوب ، اس کی مرضی کے زیادہ قریب اور حق سے زیادہ مشابہ معلوم ھو ، اس کو اختیار کر لو ۔

اس فقرے کی شرح میں ابن قیم نے حامیان قیاس اور مخالفین قیاس کے دلائل پر بڑی تفصیل سے گفتگو کی ہے ۔ یہ پوری بحث ' قانون ' عدالت اور ضابطے کے بجائے اسلام کے اصول قانون کے اہم باب ' ماخذ قانون سے تعلق رکھتی ہے ' اس لیے ہم اس کو چھوڑتے ہیں ۔ اس فقرے کی شرح میں امام سرخسی کے تشریحی نوٹ کا خلاصہ یوں ہے :

قاضی کو ایسے تمام معاملات کا ' جن کے بارے میں قرآن و سنت میں کوئی واضح ہدایت نہ ملتی ہو '

فیصلہ محض اندازا اور ظن وتخمین سے نہیں کرنا چاہیے بلکہ پوری تحقیق اور تلاش وجستجو کے بعد رائے قائم کرنی چاہیے۔ اس تاکیدی ہدایت سے یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ اگر کوئی شخص اجتہاد کرنے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو، تو اس کو ازخود منصب قضا کے قبول کرنے میں سرگرمی نہیں دکھانی چاہیے۔ لیکن اجتہادی صلاحیت رکھنے کے باوجود ایسے مسائل آسکتے ہیں جن کے حل کرنے میں اسے دقت پیش آئے، اس لیے کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ؐ میں دیے گئے احکام بہرحال معدود و محدود ہیں، جب کہ مسائل و واقعات بے شمار و لامحدود ہیں۔ ایسی صورت میں کبھی نہ کبھی ایسا ضرور ہوگا کہ ان محدود احکام میں سے کسی حکم کا کسی واقعہ پر اطلاق و انطباق کرنے میں دقت پیش آئے۔ اس دقت کو غور وفکر اور تدبر و تامل ہی سے حل کیا جاسکتا ہے۔

اب ظاہر ہے کہ اس تدبر و تامل کے بھی کچھ قواعد و ضوابط ہونے چاہییں جو اس کو صحیح رخ پر ڈال سکیں۔ ایسے ہی ایک قاعدے کی طرف حضرت عمرؓ نے مذکورہ بالا فقرے میں اشارہ کیا ہے۔ یعنی پہلے ان کلیات اور اصول کی معرفت حاصل کرو جن کے تحت قرآن وسنت کے احکام منضبط ہوتے ہیں۔ اس کے بعد ان کلیات و اصول کی، جو ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں، معرفت اور پہچان حاصل کرو۔ اس کے بعد تمہارے لیے کام آسان ہوجائے گا، اور جب بھی کوئی نئی صورت حال پیدا ہوگی، تم فوراً ان اصول و کلیات اور ان اشباہ و نظائر میں سے کسی کے تحت، اس کو لے آؤ گے، اور اس کا حکم اس نئی صورت حال پر بھی منطبق کرلو گے۔ یہ کام کرنے کے بعد تم دیکھو کہ نئی صورت حال پر کون کون سے اصول و کلیات اور کون کون سے اشباہ و نظائر کا اطلاق ہوسکتا ہے۔ ان سب میں جو حکم تمہاری رائے میں اللہ کو سب سے زیادہ محبوب، اس کی مرضی کے زیادہ قریب اور حق سے زیادہ ملتا معلوم ہو، اس کو اختیار کرلو۔ یہی قیاس کا بنیادی اصول ہے اور اسی پر فقہ اسلامی کے چوتھے اور اہم ماخذ قیاس کی عمارت قائم ہے۔

۸۔ جو شخص تمہارے سامنے یہ دعویٰ کرے کہ اس کے پاس اپنے موقف کی تائید میں کوئی حق بات موجود ہے، جو وہ اس وقت پیش کرنے سے قاصر ہے، تو اس کو اتنی مہلت دو کہ وہ اس بات کو پیش کرسکے۔ اس مہلت کے اندر اندر اگر وہ کوئی ثبوت لے آیا تو وہ اس کی بنیاد پر اپنا حق لے لے گا، ورنہ بصورت دیگر تمہارے لیے جائز ہوگا کہ تم اس کے خلاف فیصلہ دے دو۔

ایسا کرنا دراصل عدل و انصاف کے تقاضوں کو مکمل طور پر پورا کرنے کے مترادف ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مدعی کے پاس ثبوت ہوتا ہے لیکن فوری طور پر اس کو عدالت میں پیش کرنا مدعی کے لیے

ممکن نہیں ہوتا۔ اگر جلد بازی میں فیصلہ کیا جائے' اور مدعی کو ثبوت پیش کرنے کا موقع نہ دیا جائے' تو اس کا حق مجروح ہو جائے گا۔ لہٰذا اگر وہ اس کام کے لیے مہلت طلب کرے' تو اس کو مہلت دینی چاہیے۔ اس مہلت کی کوئی متعین مدت مقرر کر دینا مناسب نہیں۔ بعض فقہا نے تین دن کی مدت جو تجویز کی ہے وہ بھی ضروری معلوم نہیں ہوتی' بلکہ مقدمے کی نوعیت کے پیش نظر عدالت خود ہی کوئی مناسب وقت مقرر کر سکتی ہے۔ لیکن اگر عدالت کو کسی وجہ سے یقین ہو جائے کہ یہ شخص محض مقدمے کو طول دینا اور فریق مخالف کو پریشان کرنا چاہتا ہے' تو پھر عدالت کو چاہیے کہ ایسے شخص کو کوئی مہلت نہ دے بلکہ فوراً ہی فیصلہ سنا دے' اس لیے کہ مہلت دینا صرف اس وجہ سے ہوتا ہے کہ عدل کے تقاضے پورے ہوں۔ اگر مہلت کی وجہ سے عدل کے تقاضوں کو نقصان پہنچے تو پھر مہلت کی درخواست پر غور نہ کیا جائے۔

۹۔ مسلمان سب کے سب عادل ہیں اور ایک کی گواہی دوسرے کے خلاف قابل قبول ہے، سوائے اس کے جس کو کوئی سزائے حد دی گئی ہو۔ یا اس کے بارے میں یہ تجربہ ہو چکا ہو کہ وہ جھوٹی گواہی دیتا ہے، یا اس (کی جانب داری) کے بارے میں کوئی بدگمانی اس وجہ سے کی جا رہی ہو کہ وہ صاحب معاملہ کا (جس کے حق میں گواہی دے رہا ہے) کوئی رشتہ دار یا تعلق دار ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس امت کو امت وسط قرار دیا ہے۔ وسط کے لفظی معنی یہی ہیں کہ وہ بہترین چیز جو راست پر ہو' اور بیچ کی راہ پر عمل پیرا ہو۔ قریب قریب یہی معنی عدل کے بھی ہیں۔ اس لیے ہر مسلمان' امت وسط کا رکن ہونے کی وجہ سے عادل ہے' سوائے اس شخص کے جس نے کسی وجہ سے اپنی صفت عدل کو خود مجروح کر لیا ہو۔ مثلاً جھوٹی گواہی دے کر لوگوں کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہو۔ اسی طرح جس پر کوئی سزائے حد جاری ہو چکی ہو' اس گواہی بھی قبول نہیں کی جا سکتی۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے حد جاری شدہ لوگوں کی گواہی قبول کرنے سے منع فرما دیا ہے' اسی طرح جس شخص کے بارے میں یہ گمان کرنے کے مضبوط وجوہ موجود ہوں' کہ وہ مشہود لہ (جس کے حق میں گواہی دی جا رہی ہے) سے اس کی گواہی کے عوض کوئی فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہے' تو اس کی گواہی بھی قبول نہیں کی جا سکتی۔

جہاں تک رشتہ داروں کی ایک دوسرے کے حق میں گواہی کا تعلق ہے' تو اس کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض فقہا اس بنا پر رشتہ داروں کی گواہی کو ہر صورت میں قبول کرنے کی طرف مائل ہیں کہ قرآن مجید یا سنت ثابتہ میں ایسی کوئی صراحت نہیں کہ رشتہ داروں کی گواہی رشتہ داروں کے حق میں ناقابل قبول ہے۔ یہ رائے امام ابو محمد بن حزم اور دوسرے ظاہری فقہا کی ہے۔ بعض فقہا کے

نزدیک (جن میں امام شافعی اور امام احمد شامل ہیں) ماں باپ ' دادا دادی ' نانا نانی ' بیٹا بیٹی ' پوتا پوتی اور نواسا نواسی کی گواہی کے علاوہ 'بقیہ سب رشتہ داروں کی گواہی ایک دوسرے کے حق میں جائز ہے۔ کچھ دوسرے فقہا کے نزدیک ' اگر کسی رشتہ دار کے بارے میں فریق مخالف کو یہ بدگمانی ہو کہ وہ جانب داری سے کام لے گا تو پھر اس کی گواہی مسترد کر دی جائے گی ' اور اگر ایسی کوئی بدگمانی نہ ہو تو پھر رشتہ داروں کی گواہی قابل قبول ہے۔

یا اس کے بارے میں یہ تجربہ ہو چکا ہو کہ وہ جھوٹی گواہی دیتا ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ اگر ایک شخص ایک بار بھی جھوٹی گواہی کا مرتکب ہو جائے ' تو آیندہ اس کی کوئی گواہی بھی قبول نہیں کی جائے گی۔ جھوٹی گواہی کتنا بڑا جرم ہے ' اس کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں شرک اور جھوٹی بات کو ایک ہی سلسلہ بیان میں ذکر فرمایا ہے۔ بخاری اور مسلم دونوں نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ؐ نے فرمایا: کیا میں تم کو بہت بڑے بڑے کبیرہ گناہوں کے بارے میں بتاؤں؟ صحابہ کرام ؓ نے عرض کیا ' یا رسول اللہ ؐ ضرور ارشاد فرمایئے۔ آپ ؐ نے فرمایا ' اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا ' پھر والدین کی نافرمانی کرنا۔ (یہ فرماتے وقت رسول اللہ ؐ تکیہ لگائے تشریف فرما تھے) ' پھر سیدھے ہو کر بیٹھے اور فرمایا ' یاد رکھو اور جھوٹی بات ' یاد رکھو اور جھوٹی بات۔ ان الفاظ کو آپ ؐ بار بار فرماتے رہے ' یہاں تک کہ ہمارے دلوں میں خیال آیا کہ کاش اب حضور ؐ بس فرمائیں۔

حسن بن زیاد اپنے استاد حضرت امام ابو حنیفہ سے نقل کرتے ہیں کہ ہم ایک روز محارب بن دثار کی عدالت میں بیٹھے ہوئے تھے کہ دو آدمی آئے ' ان میں سے ایک نے دوسرے کے خلاف کچھ رقم کا دعویٰ کیا۔ مدعا علیہ نے دعویٰ کی صحت سے انکار کیا اور مدعی سے ثبوت طلب کیا۔ اس پر ایک شخص آگے بڑھا اور مدعا علیہ کے خلاف گواہی دی۔ مدعا علیہ نے گواہ کا بیان سن کر کہا: "نہیں ' قسم ہے اس خدا کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں ' اس شخص نے میرے خلاف حق کے مطابق سچی گواہی نہیں دی۔ میں تو اس کو ایک نیک شخص کے طور پر ہی جانتا ہوں ' لیکن اس سے یہ لغزش ہو گئی ہے ' جو اس نے اس ناراضی کی بنا پر کی ہے ' جو اس کے دل میں میرے خلاف موجود ہے"۔ محارب یہ ساری گفتگو تکیہ لگائے سن رہے تھے ' یہ آخری بات سن کر وہ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور بولے "اے شخص ' میں نے حضرت عبداللہ بن عمر ؓ کو یہ بیان کرتے ہوئے سنا ہے ' فرماتے تھے کہ میں نے رسول اللہ ؐ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے ' تمام انسانوں پر ایک دن ایسا ضرور آئے گا جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا ' حاملہ عورتوں کے حمل ان کے پیٹوں سے گر جائیں گے ' پرندے اپنی دموں اور پروں کو پھڑپھڑاتے ہوں گے ' اور ان کے پیٹوں میں بھی جو کچھ ہو گا ' سب باہر آجائے گا ' یہ سب اس دن کی شدت اور سختی کے ڈر

سے ہو گا' یہ ان لوگوں کا حال ہو گا جنھوں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ اس دن جھوٹا گواہ جب حساب کے لیے پیش ہو گا تو جوں ہی اس کے قدم زمین پر ٹکیں گے' اس کو اٹھا کر جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔ پس اگر تو نے سچی گواہی دی ہے تو اللہ سے ڈر اور اپنی گواہی پر قائم رہ' اور اگر تو نے جھوٹی اور بے بنیاد گواہی دی ہے تو اللہ سے ڈر اور منہ ڈھک کر اس دروازے سے باہر چلا جا"۔

۱۔ جہاں تک (گواہی کے معاملے میں) لوگوں کی پوشیدہ اور چھپی ہوئی باتوں کا تعلق ہے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی ذمہ داری خود اپنے اوپر لے لی ہے۔ اب تمھاری ذمہ داری صرف یہ ہے کہ پیش کردہ ثبوت کی بنیاد پر فیصلہ کرو۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حدود سے بچا لیا ہے کہ سوائے واضح اور مضبوط ثبوت یا قسم (حلفیہ اقرار) کے حد جاری نہیں ہو سکتی۔

یعنی جو شخص اپنے ظاہری اطوار و عادات اور عام چال چلن میں اچھا ہو' اس کو ہمیں اچھا سمجھنا چاہیے' اور اس کی گواہی قبول کر لینی چاہیے۔ اس کے دل کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔ اگر وہ شخص اپنے دل میں برا ہے' تو اللہ اس سے خود نمٹ لے گا۔ جہاں تک معاملات دنیا کا اور بالخصوص عدالتی معاملات کا تعلق ہے' تو اس کا فیصلہ لوگوں کے باطن پر نہیں بلکہ ظاہر پر ہوتا ہے۔ ان معاملات میں لوگوں کا ظاہر اصل ہے اور باطن اس کے تابع ہے۔ لیکن جب آخرت میں اصل فیصلہ ہو گا تو لوگوں کا باطن اصل ہو گا اور ظاہر اس کے تابع ہو گا۔

عراق کے بعض فقہا' بشمول امام ابو حنیفہ' نے حضرت عمرؓ کے اس قول کا مطلب یہ لیا ہے کہ ہر اس مسلمان کی گواہی قبول کر لی جائے جس میں کوئی شک والی بات نہ ہو' چاہے وہ کتنا ہی انجان اور نامعلوم ہو۔ لیکن حضرت عمرؓ کے اس قول سے ہمارے (ابن قیم کے) خیال میں یہ مطلب نہیں نکلتا۔ خود حضرت عمرؓ ہی سے روایت ہے کہ اسلام میں کسی شخص کو برے گواہوں کی گواہی کی بنیاد پر گرفتار نہیں کیا جا سکتا' اس لیے کہ ہم سب صرف عادل گواہوں کو قبول کرتے ہیں۔ یہاں حضرت عمرؓ نے مثبت طور پر عادل گواہ کی گواہی کو قبول کرنے کا ذکر کیا ہے' اس سے عراق کے ان فقہا کی رائے کی تائید نہیں ہوتی۔

(کمرہ عدالت میں) غصہ سے پرہیز کرو، تنگ دلی اور پریشانی سے بچو، لوگوں کی مقدمہ بازی سے اکتاہٹ اور تکلیف محسوس نہ کرو۔ اس لیے کہ یہی وہ مواقع ہیں جہاں تمھیں حق نافذ کرنا ہے۔ یہ کام تمھارے لیے اللہ کے ہاں اجر کا موجب اور آخرت میں بہترین ذخیرے کا سبب بنے گا۔ جو شخص اپنے اور اللہ کے درمیان حق کے معاملے میں

نیت کو صاف اور خالص کر لیتا ھے، چاھے اس کا نتیجہ اس کے اپنے ھی خلاف پڑ رھا ھو، تو اللہ تعالی اس کے اور لوگوں کے درمیان کے معاملات کو بھی صاف اور خالص کر دیتے ھیں۔ لیکن اس کے برعکس اگر کوئی شخص دنیا کے سامنے خود کو اس طرح مزین کر کے پیش کرے گا کہ اصل حقیقت، جس کو اللہ تعالی خوب جانتا ھے، اس سے مختلف ھو، تو ایسے شخص کو اللہ تعالی رسوا کرے گا۔ اس لیے کہ اللہ تعالی اپنے بندوں سے صرف وھی عبادت قبول کرتا ھے جو خالص اسی کے لیے ھو۔ تو بتاؤ، تمھارا کیا خیال ھے، اس اجر و ثواب کے بارے میں جو اللہ تعالی نے دنیاوی رزق اور اخروی خزائن رحمت کی شکل میں بندوں کے لیے محفوظ کر رکھا ھے، کیا اس کا مستحق کوئی غیر مخلص شخص ھو سکتا ھے والسلام علیکم

احیاے اسلام: چیلنج اور امکانات

پروفیسر خورشید احمد

ترجمہ: مسلم سجاد

امریکہ کے ورلڈ اینڈ اسلام اسٹڈیز انٹرپرائز (WISE) نے یونی ورسٹی آف ساؤتھ فلوریڈا کے تعاون سے احیاے اسلام پر مسلم دنیا کی معروف شخصیتوں سے مکالمہ کا آغاز کیا ہے۔ ۱۹۹۲ میں سوڈان کے ڈاکٹر حسن ترابی کے ساتھ راؤنڈ ٹیبل ہوئی اور مئی ۱۹۹۳ میں پاکستان کے پروفیسر خورشید احمد کے ساتھ۔ ایک ہی دن میں ساڑھے سات گھنٹے کی بات چیت انگریزی میں WISE نے شائع کر دی تھی۔ اسے حال ہی میں انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز نے شائع کیا ہے۔: (Islamic Resurgence : Challenges, Dircetion and future Perspectives) اردو ترجمہ بھی زیرترتیب ہے۔ اس کا ایک باب جو پروفیسر خورشید احمد کا بنیادی خطاب ہے، ہم پیش کر رہے ہیں۔ (مدیر)

سب سے پہلے میں ورلڈ اینڈ اسلام اسٹڈیز انٹرپرائز (WISE) اور یونی ورسٹی آف فلوریڈا کا اور آپ سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں، جنھوں نے مجھے آج آپ کے ساتھ مل بیٹھنے اور ایک ایسے موضوع پر اپنے خیالات کے اظہار کا موقع دیا ہے جو مجھے عزیز ہے اور آپ کے لیے بھی فکرمندی کا باعث ہے۔ میرے نزدیک یہ بات بڑی اہم ہے کہ اہل علم اور دانش وروں نے ماضی کی طویل روایت کے مطابق ایک دوسرے کے بارے میں بات کرنے کے بجائے تبادلہ خیال کی فضا میں ایک دوسرے سے بات کرنا شروع کر دی ہے۔ یقیناً یہ ایک اہم پیش رفت ہے اور میرے خیال میں اس کا کریڈٹ آپ جیسے اہل علم اور دانش وروں کو جاتا ہے، جنھوں نے ایک طرح کی خود کلامی کو حقیقی مکالمہ میں تبدیل کر دیا ہے۔ ہم یہاں اس لیے جمع ہیں کہ ایک دوسرے سے بات کریں، بحث کریں، اختلاف کریں اور پھر بھی اپنی بات چیت جاری رکھیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ وہ حقیقی سپرٹ ہے جس میں ہم آج مل رہے ہیں اور میں ذاتی طور پر آپ میں سے ہر ایک کا، تبادلہ خیال کی اس محفل میں آنے پر ممنون ہوں۔ میں اپنی گفتگو

اصل موضوع یعنی احیاے اسلام کی اہم خصوصیات تک محدود رکھوں گا۔

احیاے اسلام کے عمل کو صحیح صحیح سمجھنے کے لیے ہمارے پاس کوئی تصوراتی ڈھانچہ ہونا چاہیے۔ ۱۸۴۸ء میں جب کارل مارکس (م ۱۸۸۲) اور فریڈرک اینجلز (م ۱۸۹۵) نے کمیونسٹ پارٹی کا مینی فیسٹو پیش کیا' تو انھوں نے اسے بے حد دلچسپ جملے سے شروع کیا: "یورپ پر ایک آسیب منڈلا رہا ہے: کمیونزم کا آسیب A specter is haunting Europe: the specter of Communism ڈیڑھ صدی بعد آج کے لٹریچر اور میڈیا پروگرام دیکھ کر ایسا لگ رہا ہے جیسے کہ "آج مغرب پر ایک نیا آسیب منڈلا رہا ہے: اسلامی بنیاد پرستی کا آسیب!" مگر ایک فرق ہے۔ کمیونزم کو آسیب قرار دینے والے خود مارکس اور اینجلز تھے' جب کہ یہ مسلمان نہیں ہیں جو اپنے نظریہ حیات اور پروگرام کو بطور آسیب پیش کر رہے ہیں۔ یہ بھی بڑی دلچسپ بات ہے چاہے اس میں کوئی سازش نہ ہو کہ اپنی فکر اور پیغام کو کمیونزم کا نام مارکس نے خود دیا' لیکن مسلمانوں کو یہ اختیار بھی نہیں دیا گیا ہے کہ ان کا مذہب اور تہذیبی نقشہ اس نام سے پہچانا جائے جو وہ خود اسے دیں' یہ حق دوسروں نے خود ہی حاصل کر لیا ہے کہ وہ ہمارا نام اور ہمارے کام تجویز کریں' اور اس طرح اسلامی بنیاد پرستی کا ہوا کھڑا کریں!

میں اپنی بات اس عزم کے ساتھ شروع کر رہا ہوں کہ آپ کے سامنے مکمل دیانت اور معروضیت کے ساتھ اپنا موقف پیش کروں' اور یہ بتاؤں کہ ایک مسلمان احیاے اسلام کو کس نظر سے دیکھتا ہے۔ میری حیثیت کچھ خصوصی خیالات کے لیے ایک سیلزمین کی نہیں ہے۔ میں اس علمی مذاکرے میں اس جذبے سے شریک ہوا ہوں کہ ایک طرف اپنی بات کسی رورعایت کے بغیر پیش کروں اور دوسری طرف آپ کے ردعمل اور مشاہدات سے استفادہ کروں۔ ہمارا مقصد مناظرہ اور کج بحثی نہیں' دیانت اور انکسار سے حقیقت کی تلاش اور مسلمانوں کی موجودہ فکری اور ذہنی کیفیت' ان کے تہذیبی عزائم اور امنگوں کی تفہیم ہے۔

تصوراتی پس منظر

احیاے اسلام ایک عالم گیر لہر ہے' یہ کسی جغرافیائی اکائی میں محدود نہیں۔ یہ کوئی ایسی چیز بھی نہیں جو اچانک رونما ہو گئی ہو۔ یہ ایک فطری تہذیبی عمل ہے' جسے اس کے تصوراتی اور تاریخی پس منظر میں ہی سمجھا جانا چاہیے۔

ہم مسلمان یہ ایمان رکھتے ہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ازل سے انسانیت کی ہدایت کے لیے جو راستہ اپنے رسولوں کے ذریعے بتایا ہے وہ اسلام ہی ہے' اور جو اس ہدایت کو قبول کر لیتے ہیں اور اپنے

آپ کو اس کے حوالے کر دیتے ہیں ' وہ مسلمان ہیں ۔ ہمیں یہ ہدایت ایک مقدس کتاب کی شکل میں فراہم کی گئی ہے 'جس میں اللہ تعالیٰ کا بے آمیز کلام محفوظ ہے ۔ یہ کتاب ایک پیغمبرؐ کے ذریعے نازل کی گئی ۔ انھوں نے اسے دیانت داری سے پہنچایا ' اس کی تشریح کی ' اور اس کے احکامات اور ہدایات پر عمل ' انفرادی نمونے اور اجتماعی تحریک کی شکل میں 'کیا ۔ اس کوشش کے نتیجے میں اس خیال 'تصور اور ہدایت کو افراد کی زندگیوں میں اور ان کے معاشرے میں روبہ عمل لانے کے لیے ایک تحریک برپا ہوئی ۔

ہم یہ ایمان بھی رکھتے ہیں کہ قرآن اللہ کی آخری کتاب ہے اور محمدؐ آخری نبی ہیں ۔ اس لیے جہاں کتاب و سنت میں آفاقی حقائق 'نصب العین ' اصول اور اقدار مذکور ہیں ' وہاں اس میں ایسا طریق کار بھی موجود ہے کہ مختلف ادوار اور زمانوں کی ضروریات پوری ہو سکیں ۔ نہ یہ ہمارا دعویٰ ہے ' نہ اس نظام ہدایت میں تمام تفصیلات کی تلاش درست ہے ۔ یہ صرف بنیادی امور کو بیان کرتی ہے ' اور فرد اور معاشرے کی زندگی کے لیے یہ ایک معین نقطہ نظر اور راہ نما خطوط دیتی ہے ۔ اب یہ ذمہ داری امت کی ہے کہ اس نقطہ نظر کو اختیار کرے ' اور ان راہ نما خطوط پر چلتے ہوئے ' اس نصب العین کو زمان و مکاں میں عملاً برپا کرے ۔ اس میں ہر زمانے کے تقاضوں کو پورا کرنے اور تبدیلی اور اختراع کے لیے خودکار نظام موجود ہے ۔ اسی لیے ' از سر نو غور و فکر ' جدت و اختراع ' نئے حالات پر اطلاق ' ادعا اور تبدیلی کا عمل ' مسلم تاریخ کے تمام ادوار میں ایک ممتاز عمل رہا ہے ۔ آج احیاے اسلام محض چند مخصوص معاصرانہ چیلنجوں کا نتیجہ نہیں ہے ۔ اسے اس کے اصولی پس منظر ' تاریخی تسلسل اور معاصر دنیا کے چیلنجوں پر مسلمانوں کے ردعمل ' دونوں کے تناظر میں دیکھا جانا چاہیے ۔

سب سے پہلے ہمیں دو پہلوؤں پر غور کرنا چاہیے: ایک ' داخلی پہلو ' جو مسلمانوں کے تاریخی شعور کا حصہ ہے ۔ یہ انھیں اپنی تاریخ پر ایک منفرد انداز سے غور کرنے اور مستقبل کے لیے ایسے حل تلاش کرنے پر آمادہ کرتا ہے جن کی جڑیں ان کے اس پس منظر میں پیوست ہوں ۔ دوسرے ' خارجی ماحول ' یعنی سیاست ' علم و دانش 'معیشت ' اداروں اور فنیات کی حقیقی صورت حال ۔ مسلمانوں کو ان چیلنجوں کا بھی جواب دینا ہوتا ہے ۔

پس احیاے اسلام ' داخلی اور تاریخی ' دونوں صورت حال کا جواب ہے ۔

تاریخی پس منظر

بہت زیادہ گہرائی میں جائے بغیر ' احیاے اسلام کی حالیہ تاریخ میں تین مراحل نظر آتے ہیں:

(۱) قبل نو آبادیاتی ' (۲) نو آبادیاتی ' (۳) بعد نو آبادیاتی ۔

۱ ۔ قبل نو آبادیاتی: میں اعتراف کرتا ہوں کہ مسلمانوں کی تاریخ میں عروج و زوال اور مدوجزر

ہوتے رہے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں مسلسل ترقی کا عمل نہیں رہا ہے۔ مختلف وجوہات کی بنا پر، جن میں سے بیشتر داخلی ہیں، مسلم معاشرہ 'نو آبادیاتی دور سے پہلے' یعنی ۱۶ تا ۱۸ ویں صدی میں، زوال سے دوچار تھا، اور وہ پیش آمدہ چیلنجوں پر، خصوصاً سائنس اور ٹیکنالوجی، زراعت اور صنعت، آلات حرب اور معیشت کے میدانوں میں تخلیقی ردعمل کے اظہار سے قاصر تھا۔

۲۔ نو آبادیاتی: دوسرے مرحلے میں، جسے نو آبادیاتی دور کہا جاتا ہے، جب ہمارا مغرب سے آمنا سامنا ہوا تو ہم عالمی منظر سے پسپا ہو جانے کی وجہ سے برابر کے مقابلے پر نہیں تھے۔ ۱۹ ویں صدی کے اختتام تک تقریباً کل مسلم دنیا، ماسوائے چار غیر اہم مسلم ممالک کے، نو آبادیاتی حکمرانوں کے زیر نگیں آگئی تھی۔ اس دور میں اسلام ہی وہ محور تھا جس کے گرد جمع ہو کر، مسلم ممالک پر حملوں، مغرب کی مداخلت اور نو آبادیت کے خلاف مزاحمت کی گئی۔ جب نو آبادیاتی حکومت قائم ہوگئی تو پھر یہ اسلام ہی کا دیا ہوا سیاسی آزادی، قومی شناخت اور عزت اور وقار کا احساس تھا، جس کی وجہ سے سامراجی حکمرانوں کے خلاف مسلسل مزاحمت جاری رکھی جا سکی۔

۳۔ بعد از نو آبادیاتی: ۲۰ ویں صدی کے بعد از نو آبادیاتی دور میں، نو آبادیت کے ورثے اور معاشرہ کی تشکیل نو کے چیلنج کا مقابلہ کرنے والی بڑی قوتوں میں اسلام بھی تھا۔ میرے خیال سے آج احیاے اسلام کو اس نظریاتی تناظر میں دیکھا جانا چاہیے۔

ان تمام مراحل میں اسلام اور مغرب کے درمیان علمی، اجتماعی اور سیاسی، کئی سطحوں پر مقابلہ ہوا ہے۔ علمی لحاظ سے دیکھا جائے تو اسلام کے پاس اپنا نظریہ کائنات (ورلڈ ویو) ہے۔ اجتماعی سطح پر یہ فرد، معاشرے، معیشت اور اجتماعی روابط کے بارے میں واضح اجتماعی اور تہذیبی اقدار دیتا ہے۔ نو آبادیت کے نتیجے میں اسلام کی اجتماعی اور تہذیبی اقدار، سیکولر مغربی اقدار اور عیسائیت دونوں کے حملوں کی زد میں آئیں۔

سیاسی محاذ پر مسلمان اپنی طویل تاریخ میں پہلی مرتبہ اقتدار سے محروم ہوئے، جبکہ ماضی میں مسلمانوں نے ہمیشہ کسی ایک سیاسی محاذ پر کچھ کھویا تو کسی دوسرے محاذ پر کچھ پالیا۔ زوال بغداد اگر زوال کے انتہائی نکتہ کا اظہار تھا، تو قسطنطنیہ کی فتح ایک نئے عروج کی علامت تھی۔ اگر شرق اوسط میں شکست کا سامنا تھا تو جنوب مشرقی ایشیا، مغربی اور وسطی افریقہ اور وسطی اور جنوبی ایشیا میں وہ توسیع اور عروج کے راستے پر گامزن تھے۔ گذشتہ دو تین صدیوں میں سیاسی اقتدار سے اس محرومی نے یقیناً مسلمانوں کی نفسیات اور ردعمل کی صلاحیت کو متاثر کیا ہے۔ اس کے نتیجے میں احیاے اسلام کی معاصر تحریکوں میں مختلف نوعیت کے انداز نمایاں ہیں۔ سیاسی عوامل کے ساتھ ساتھ، معاشی اور تکنیکی پہلوؤں نے بھی

احیا کی نشو و نما کو متاثر کیا ہے۔

میں ایک بات کی طرف خاص طور سے توجہ دلانا چاہوں گا: نو آبادیاتی دور کے دو سو برسوں میں مسلم معاشروں میں ایک بنیادی تغیر واقع ہو گیا۔ ماضی میں جب زوال سے واسطہ پیش آیا تو معاشرے کے ادارے ' خصوصاً عدلیہ ' تعلیم ' قانون ' معیشت ' خاندان اور فوج نے اپنا اسلامی تشخص برقرار رکھا۔ نو آبادیاتی دور میں ان اداروں میں سے بیشتر مغربی اداروں سے مغلوب ہو گئے یا تبدیل ہو گئے۔ مغربی تصورات اور ادارے مسلم معاشروں کے ہر گوشے میں اس حد تک دخیل ہو گئے کہ خاندان تک کو بھی ' مغربی نمونوں کے مطابق تشکیل نو کر کے ' ماڈرن بنایا جا رہا ہے۔ اسی کے نتیجے میں مسلم معاشروں میں ایک نئی قیادت ابھری ہے ' جس کی جڑیں نہ مسلم عوام میں ہیں نہ مسلم روایت میں۔ مسلمان مملکتوں میں یہ مغرب زدہ سربرآوردہ طبقہ تعلیمی اور نفسیاتی لحاظ سے اور افتادِ طبع کے حوالے سے مغرب کے نو آبادیاتی نظام کے لیے بقائے باہمی کے اصول پر پروان چڑھا۔

مغرب کے تسلط کے نتیجے میں مسلم معاشرے کی تمام سطحوں پر ایک نئی طرح کی قلب ماہیت اور ایک ناگزیر بحران کا آغاز ہو گیا۔ اس تصادم کے جواب میں قوم پرستی کا آغاز ہوا۔ قومی تحریک کو برپا کرنے والا بنیادی اور ابتدائی محرک مذہب تھا ' گو کہ اس میں قوم پرستانہ اور سیکولر لہجہ بھی شامل تھا۔ قومی قیادت نے اپنا جواز اور اپنی حمایت عوام سے حاصل کی۔ مگر ' اگرچہ قوم پرستوں میں کچھ مخلص افراد بھی تھے ' لیکن قیادت کی اکثریت کی تربیت اس طرح ہوئی تھی کہ حصول آزادی کے بعد امت کی تمناؤں کو پورا کرنے کے بجائے انھوں نے قومی امنگوں کی تکمیل میں اسلام کو نظر انداز کر دیا۔ مسلم عوام نے محسوس کیا کہ ان کے ساتھ دھوکہ ہوا ہے۔ یہ پس منظر ہے جس میں احیائے اسلام نے اپنے کو پیش کرنا شروع کیا۔

میری رائے میں ' پہلی جنگ عظیم کے بعد ' کیونکہ بیشتر مسلم مملکتوں میں نو آبادیاتی دور جاری تھا ' احیائے اسلام کو بنیادی پر زور دینا تھا کہ مسلمانوں کو سیاسی اور علمی و نظریاتی دونوں طرح کی آزادی درکار ہے۔ نو آبادیات محض سیاسی عمل نہیں ہے۔ اس لیے نو آبادیت سے چھٹکارا ' صرف سیاسی نہیں بلکہ علمی ' تہذیبی اور معاشی عمل بھی ہے۔ یہ صرف ڈاکٹر محمد اقبال ' مولانا مودودی ' حسن البنا ' مالک بالنبی اور سعید نورسی جیسی عظیم مفکر شخصیات ہی نے نہیں بلکہ ہر طرح کے مسلمانوں نے ہر سطح پر مغربی نو آبادیاتی نظام کو چیلنج کیا۔

نو آبادیاتی تجربے کے دوران مسلم ترجیحات کا از سر نو تعین کیا گیا۔ مسلمانوں نے محسوس کیا کہ جس طرح سیاسی آزادی حاصل کرنا ضروری ہے ' اسی طرح انفرادی اور اجتماعی سطح پر اسلامی تشخص قائم

کرنے کے لیے منظم کوشش کی جانا چاہیے ' اس لیے میرے خیال سے احیاے اسلام کی موجودہ تحریک ' بنیادی طور پر داخلی تجدید نو کی تحریک ہے - خود شناسی اور خودگری کی تحریک ہے - ایک انقلابی جذبہ 'ایک عزم نو اور از سر نو طاقت کے حصول کی تحریک ہے - یہ تحریک مسلمانوں کو اخلاقی 'علمی ' تہذیبی اور نظریاتی لحاظ سے ان کی اصل بنیادوں تک لے جاتی ہے -

نو آبادیاتی تسلط اور مسلمانوں کی بنیادوں کے لیے اس کے چیلنج کی وجہ سے احیاے اسلام ہر سطح پر آزادی کا علمبردار ہے - اس کا لہجہ سیاسی ضرور ہے لیکن احیاے اسلام بنیادی طور پر ایک مذہبی اور اخلاقی تحریک ہے - اس کی حقیقت ایمان کے احیا اور استحکام پر مبنی ہے ' یہ اللہ تعالیٰ سے اس عہد کو تازہ کرنے کے لیے خودنگری کی داعی بھی ہے ' تاکہ مسلمان روحانی ' اخلاقی اور مذہبی طرز پر زندگی گزار سکیں - یہ بڑی بدقسمتی کی بات ہے کہ احیاے اسلام پر بیشتر مغربی لٹریچر ان اہم حقائق کو سامنے نہیں لاتا - میری رائے میں احیاے اسلام کے سیاسی ' اجتماعی اور تشکیلی پہلو ' اخلاقی تجدید نو ہی کے ظاہری مظاہر ہیں ' جس کے بغیر ناکامی مقدر ہے -

درحقیقت احیاے اسلام کا منفرد کردار ' زندگی کے روحانی اور مادی پہلوؤں کی یک جائی پر اصرار ہے - یہی سارے مسئلے کی جڑ بنیاد ہے ' اصل مسئلہ ہے -

میں یہ کہنے کی جسارت کروں گا کہ احیاے اسلام جس طرح مادی اور روحانی پہلوؤں کی یک جائی کرنا چاہتا ہے ' بہت سے مغربی اہل علم کو اسے سمجھنے میں دقت پیش آرہی ہے - وجہ یہ ہے کہ نشاۃ ثانیہ کے بعد سے مغربی فکر کا اصل دھارا روح اور مادہ کی کھلی یا چھپی تقسیم پر مبنی رہا ہے - انسانی معاملات میں اللہ تعالیٰ کی مرکزی حیثیت کی نفی اور عقلیت کی فتح کے نتیجے میں مغربی فکر نے معاشرہ ' طرز حکومت اور معیشت میں وحی ' اخلاق اور مذہب کے کردار کو نظرانداز کیا ہے - (دیکھیے : G. Vattimo, The End of Modernity Nihilism and Hermeneutics in Post modern Culture, 1988)

احیاے اسلام : روایتی فکر ، فرقہ واریت اور جدت پسندی

جدید اسلامی فکر ' جو احیاے اسلام پیش کرتا ہے ' مادہ اور روح کی یک جائی اور معاشرے اور اس کے اداروں کی اصلاح کے ذریعے روحانیت حاصل کرنے کی بات کرتی ہے - مادی دنیا اسی باطنی حقیقت کا اظہار ہے - احیاے اسلام کی ایک اور اہم خصوصیت ' معاشرے اور مذہب کا ربط بھی روح اور مادے کی اسی یک جائی پر قائم ہے - اسلامی فکر کے مطابق ' مذہب اور طرز حکومت ' اور اخلاق اور

قانون ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ قانون الٰہی ہر بات کی تمام تفصیلات فراہم کرتا ہے 'بلکہ وہ راہ نما خطوط پیش کرتا ہے اور لوگوں کو متحرک کرنے کے طریقے اور رویے متعین کرنے کے لیے سیاق فراہم کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام معاشروں اور اداروں میں تبدیلی لانے کو غیر معمولی اہمیت دیتا ہے۔ مغربی طرز فکر بالکل مختلف ہے۔ اس میں یہ فرض کیا جاتا ہے کہ اداروں میں 'تعلیم میں 'ماحول اور ساخت میں تبدیلی سے ہمہ جہت تبدیلی پیدا ہوگی۔ اس کے برخلاف اسلامی نقطہ نظر کے مطابق اصل تبدیلی انسان کے قلب و روح میں 'تخیل میں 'تحرک میں اور مستقبل کے تصور میں لانا چاہیے۔ اور پھر اسے اجتماعی اداروں' معاشرتی حقائق' سیاست' معیشت' عدلیہ سب کا احاطہ کر لینا چاہیے۔

آخری بات یہ ہے کہ احیاے اسلام 'مسلم معاشرے کے حوالے سے 'کچھ روایتی رویوں میں تبدیلی کا اظہار بھی ہے۔ مثلاً ایک رویہ 'قرآن و سنت کے مقابلے میں قانون و فقہ پر ضرورت سے زیادہ زور دینا ہے۔ روایت 'مذہبی قیادت پر علما کو فائز کرتی ہے 'جنھوں نے یقیناً ہماری تاریخ میں نہایت درخشاں کردار ادا کیا ہے۔ عام علما رجعت پسند بھی نہیں رہے ہیں۔ لیکن ماضی میں 'ایک قسم کی قدامت پسندی بڑھ آئی' اور قرآن و سنت پر مبنی ایک مستحکم نظام قانون قائم ہوا۔ یہ قانون ہی انفرادی اور اجتماعی زندگی پر حکمرانی کرتا رہا۔ آہستہ آہستہ --- اور اس میں بڑا دخل اس نظام تعلیم کو تھا جس پر جمود طاری ہوگیا تھا اور وہ معاصر علمی تہذیبی اور سیاسی اثرات سے کٹ گیا تھا-- - اصل ماخذ 'یعنی قرآن و سنت اور مجموعہ قانون 'یعنی فقہ' میں فاصلہ پیدا ہو گیا۔ نتیجتاً قرآن و سنت سے براہ راست اخذ کی اہمیت کم ہوگئی اور قانون کی پابندی زیادہ اہمیت اختیار کر گئی۔ اس طرح جمود پیدا ہو گیا۔

اس پس منظر میں 'احیاے اسلام ایک حرکی عامل ہے۔ یہ روایت 'قانون اور رواج کی اہمیت کا انکار نہیں کرتا بلکہ ترجیحات کی ایک نئی ترتیب پیش کرتا ہے۔ اس ترتیب سے --- روایت اور تاریخی ارتقا سے اعراض یا بغاوت کیے بغیر--- تغیر کے ان تقاضوں کی تکمیل ہوتی ہے جو خود معاشرے کے اندر سے ظاہر ہوتے ہیں۔ ترجیحات کی نئی ترتیب کی اس شعوری کوشش کے نتیجے میں احیاے اسلام کے فکری قائدین نے ثانوی اور فروعی کے مقابلے میں بنیادی اور ضروری پر زور دیا ہے۔ اسلامی تحریکوں نے رواداری اختیار کر کے اور اسلام کے مختلف مکتبہ ہاے فکر کے درمیان اشتراک کے وسیع امکانات کی نشاندہی کر کے فرقہ واریت کے خلاف موقف اختیار کیا ہے۔ احیاے اسلام کا رویہ 'نام نہاد جدت پسندوں کے رویے سے بالکل مختلف ہے 'جو بظاہر اسلام سے رشتہ قائم رکھ کر 'اس طرح کی تعبیریں کرتے ہیں کہ بیشتر اسلامی اقدار اور اقدار کو مغرب کی آزاد روی کی اقدار اور ان کی علمی 'سیاسی اور

معاشی بنیادوں کے مطابق بنایا جاسکے۔ (دیکھیے : F. Rahman کی Islam & Modernity) 1982 کچھ دوسرے بدعت پسند سوشلسٹ نظام کی طرف زیادہ مائل تھے۔ انھوں نے اسلامی اقدار اور احکامات کے اندر سوشلزم کی کوئی قسم پڑھنے کی کوشش کی۔ مختصراً کہا جاسکتا ہے کہ ماڈرن اسلام کو اندر سے تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔ ایسی تعبیر کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو اسے لبرلزم کی مغربی اقدار کے قریب لے آئے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ وہ اجتہاد کے اصول کو استعمال کرتے ہیں' لیکن وہ اجتہاد کی شرائط اور آداب کا لحاظ رکھنا ضروری نہیں سمجھتے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کی ماڈرنسٹ تعبیر کو مذہبی سند حاصل نہیں ہو سکی ہے۔

اس کے مقابلے میں اسلامی تحریکوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ 'اسلامی اقدار اور احکامات کے بارے میں کسی قسم کے احساس کمتری کے بغیر' اور قرآن و سنت کی حدود میں رہتے ہوئے 'فقہ پر دوبارہ ایک نظر ڈالنی چاہیے۔ اس کے علاوہ احیاے اسلام نے یہ فکر بھی پیش کی ہے کہ مغربی تہذیب 'مغربی فکر' اور مغربی اقدار کو بند ذہن سے نہیں' بلکہ کھلے ذہن سے دیکھنا چاہیے۔ جدید مغربی دنیا میں بہت سے ایسے کام ہوئے ہیں' جو انسانیت کی مستقل میراث کا حصہ بن گئے ہیں۔ میری رائے میں مسلمانوں کو انھیں صرف اس وجہ سے نہ ٹھکرا دینا چاہیے کہ وہ مغربی ہیں۔ لیکن ان کو اپنی اقدار کے ساتھ مخلص اور وفادار رہنا چاہیے۔ وہ معیار جس پر مسلمانوں کو طے کرنا چاہیے کہ کس چیز کو قبول کرلیں اور جذب کرلیں اور کس چیز سے احتراز کریں اور مسترد کر دیں' ان کی اپنی اقدار ہیں۔ مسلمانوں کو اسلام کے فکری اور اخلاقی کردار کی بقا و تحفظ کا اہتمام کرنا چاہیے' اور سوچ سمجھ کر ہر اس چیز سے بچنا چاہیے جو 'اسلامی فکر سے متغائر اور متناقض ہو۔

یہ ہے روایات' فرقہ واریت اور تجدد کے بارے میں اسلامی تحریک کا رویہ۔ (دیکھیے : M.Berman, All That is Solid Melts into Air: The Experience of Modernity, 1988)

کچھ لوگ اسلامی تحریک کو الزام دیتے ہیں کہ یہ تفصیلات سے گریز کرتی ہے' اور یہ کہ اس کے پاس اجتماعی اور معاشی زندگی میں تبدیلی کا مفصل پروگرام نہیں ہے۔ میں اس بارے میں یہ عرض کروں گا کہ 'اسلامی تحریک نے ایک نیا علمی' سیاسی' معاشی اور تہذیبی رخ دینے کی کوشش کی ہے۔ وہ سطح جس پر اسلامی تحریک اپنا پیغام دے رہی ہے' بنیادی طور پر تہذیبی سطح ہے۔ اس سطح پر پیغام دینے میں جن تفصیلات میں جانا ضروری ہے' اسلامی تحریک کو انھیں نظر انداز کرنے کا الزام دینا ناانصافی ہے۔

احیاے اسلام اور تہذیب

تہذیبی سطح پر 'اسلامی تحریک نے متعدد سوال اٹھائے ہیں: (۱) مسلم معاشرے کی حقیقت کیا ہے ' اور اس کے مذہبی ' اخلاقی اور تہذیبی عناصر ترکیبی کیا ہیں ' (۲) معاشرے کی تعمیر کس بنیاد پر ہوتا ہے ' (۳) معاشرے کے بنیادی اداروں -- - مثلاً خاندان ' شہر ' محلے اور وقف - - کا کیا کردار ہے ' (۴) اسلامی ریاست کی کیا نوعیت ہے ' اسلامی دستور کے لازمی خواص کیا ہیں اور مسلم حکومت کے لیے بنیادی راہ نما خطوط کیا ہیں ' (۵) قیادت کا کام کیا ہے ' (۶) غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات کس طرح تشکیل دیے جائیں گے ' (۷) اسلامی ریاست خارجہ پالیسی میں کن امور کو آگے بڑھائے گی ' اور (۸) آخری بات یہ کہ اسلامی ریاست کے لیے معیشت کا کیا تصور ہے؟

اسلامی ریاست کے ضمن میں 'ہمیں اسلامی معیشت کی نوعیت ' اور اس سلسلے میں مسلمان ماہرین سیاست اور معیشت نے گذشتہ نصف صدی میں جو کام کیا ہے ' اسے سنجیدگی سے لینا چاہیے- یہ پروپیگنڈا مواد نہیں ہے ' اور نہ ہی محض نیک خواہشات کا مجموعہ- یہ سنجیدہ اور نتیجہ خیز کام ہے -بہت کام کیا گیا ہے 'پھر بھی میرے نزدیک یہ توقع کرنا یا مطالبہ کرنا درست نہیں کہ مسلم قیادت کے اقتدار میں آنے سے پہلے تفصیلی نقشہ کار سامنے آنا چاہیے- پالیسی سازی ' اجتماعی تبدیلی اور معاشی پروگرام ' ایک طرف ' اقدار ' اصول اور معیارات اور دوسری طرف عملی حقائق کے باہم تعامل سے ہی تشکیل دیے جاسکتے ہیں- انھیں کسی ریسرچ لیبارٹری میں تیار نہیں کیا جاسکتا-

جدید معاشی لبرلزم کے باوا آدم 'ایڈم اسمتھ Adam Smith (م ۱۷۹۰) نے اپنی کتاب میں کوئی ایسا تفصیلی نقشہ کار نہیں دیا جیسا کہ آج معاشیات کی ایک اوسط درجہ کی کتاب میں مل جاتا ہے ' نہ اس نے وہ تفصیلات بیان کیں جو ایک معاشی پروگرام میں ملتی ہیں- سمتھ صرف ایک نیا معاشی نقطہ نظر دیتا ہے اور ۱۸ ویں صدی کی معاشی صورت حال کی تعبیر کرنے کی کوشش کرتا ہے - ۱۲۰ برس بعد الفرڈ مارشل Marshall (م - ۱۹۲۴) نے معاشیات کی پہلی درسی کتاب لکھی ' جس میں اس نے ایک جدید معیشت کی کارکردگی ' اس کے اہم قوانین اور ان کے پالیسی مضمرات سے بحث کی - دوسری طرف کارل مارکس کی داس کیپٹل کی تین ضخیم جلدوں میں بھی اجتماعی ارتقا کے چند قوانین اور سرمایہ داری کی ناانصافیوں کے بارے میں تو ڈھیروں مواد ملتا ہے 'لیکن منصوبہ بندی کے ادارے کا ' جو سوشلسٹ نظام کی بنیاد بنا ' دور دور تذکرہ نہیں ہے - سوشلزم کی معیشت کی شکل تو بیسویں صدی میں اس وقت بنی ' جب ماہرین معاشیات آسکر لانگے Oskar Lange (م-۱۹۶۵) اور ہنری ڈکنسن Dicknson Henry (م-۱۹۶۸) نے مائی سز (Mises) کی تنقید کا جواب دیا- اس کے بعد سوویت یونین کے

مرکزی معاشی منصوبہ سازوں کو جب ایک نئی معیشت قائم کرنے سے واسطہ پڑا انھوں نے اس کے خدوخال واضح کیے۔ ۱۹۱۷ کا بالشویک انقلاب بنیادی طور پر ایک سیاسی واقعہ تھا، جس کا مقصد ریاست کے سیاسی اقتدار کا خاتمہ تھا۔ ۱۹۲۳ سے ۱۹۳۲ تک سوویت ریاست کو ہر چیز کو دوبارہ سوچنا پڑا۔ ۱۹۳۲ میں کمیونسٹ پارٹی اس قابل ہو سکی کہ اپنا پہلا پنج سالہ قابل عمل منصوبہ لے کر آئے۔ علاوہ ازیں سوشلزم کی معیشت پر بھی درسی کتاب روس میں ۱۹۲۸ میں شائع ہوئی۔

تاریخ میں اسی طرح معاملات انجام پاتے ہیں۔ اسلامی تحریک مستقبل کے لیے کوئی بلیو پرنٹ لے آئے، یہ توقع سے بہت زائد ہے۔ یہ بلیو پرنٹ کسی لیبارٹری میں تیار نہیں کیے جاسکتے، بلکہ معاشرے اور معیشت کی مخصوص تجربہ گاہ میں عمل کر کے تیار کیے جاتے ہیں۔ یہی ہمارا اعتماد ہے۔

احیاے اسلام اور مغرب

اسلامی تحریکوں کے مغرب سے روابط کے معاملے میں مشکل اصطلاحات کی ہے۔ مغرب صرف جغرافیائی حقیقت نہیں، ایک تصور اور ایک فکر بھی ہے۔ مغربی تہذیب کچھ اصولوں اور اقدار کی علم بردار ہے، جن کا دائرہ عالمی ہو سکتا ہے، میں اس کا انکار نہیں کرتا۔ مگر یہ بات واضح ہے کہ ایک سیاسی اور معاشی حقیقت کے طور پر، مغرب ایک غالب جغرافیائی طاقت ہے اور بدقسمتی سے مغرب اور باقی دنیا گذشتہ چار، پانچ صدیوں سے باہم متصادم ہیں۔ اس عرصہ میں باقی دنیا اور خصوصاً مسلم دنیا کا استحصال کیا جاتا رہا۔ ہم پسند کریں یا نہ کریں، اس تاریخی پس منظر نے ہمارے رویوں کو متاثر کیا ہے۔

دوسری طرف، اسلام، جغرافیائی نقطہ نظر سے ۵۲ ریاستوں میں اکثریت کا مذہب ضرور ہے، مگر وہ جغرافیائی خطے کے ساتھ بندھا ہوا نہیں ہے۔ وہ ایک نظریہ حیات ہے، ایک مذہب ہے، ایک تہذیبی رویہ ہے، ایک عالمی پیغام ہے۔ اسلام کے پیروکار ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اگر مسلم اکثریتی علاقوں میں ۸۰ کروڑ مسلمان ہیں تو باقی دنیا میں ۴۰ کروڑ سے زیادہ مسلمان ہیں۔ ان وجوہات سے اسلام کا مغرب سے مقابلہ ایک پیچیدہ اور کثیر الجہتی عمل ہے۔

اسلام اور مغرب کے تعلق کی دو جہتوں پر ضرور غور کرنا چاہیے۔ پہلی، ان اقدار اور اصولوں کا موازنہ، جن کے مغرب اور اسلام، علم بردار ہیں۔ کچھ ایسے دائرے ہیں جہاں دونوں کے درمیان کوئی تنازعہ نہیں ہے، لیکن کچھ دوسرے دائروں میں، ان میں بنیادی اقدار بھی شامل ہیں، ان میں اختلاف ضرور ہے۔ ہمیں اس اختلاف کو کوئی خطرہ یا کوئی ایسی چیز نہ سمجھنا چاہیے جس کا نتیجہ لازماً دشمنی یا تلخی کی صورت میں نکلے، بلکہ اسے صحت مند مقابلے کا اور ایک دوسرے سے کچھ سیکھنے سکھانے کا موقع سمجھنا چاہیے۔ تاریخ میں ایک وقت ایسا تھا کہ جب خیالات و اقدار سیاسی طاقت کے ذریعے مسلط کیے جاتے

تھے ۔مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ حالیہ تاریخ کی ایک اہم پیش رفت 'خیالات کا آزادانہ اظہار ' اور بحث و مباحثہ اور ابلاغ کی آزادی ہے ۔اس پہلو سے 'ہل سنکی (Helsinki) شہری اسمبلی میرے خیال میں ایک نہایت اہم پیش رفت ہے ۔اس پس منظر میں ہمیں اسلام اور مغرب کے درمیان صحت مند مکالمے کی حوصلہ افزائی کرنا چاہیے۔

دوسری جہت ' دونوں کے سیاسی ' معاشی اور اسٹریٹیجک مفادات سے اور مغربی دنیا کے موجودہ تسلط سے متعلق ہے ۔اس حوالے سے میری پہلی درخواست یہ ہے کہ اسلام اور اسلامی تحریکوں کو مغربی تہذیب کے لیے خطرہ نہیں سمجھنا چاہیے۔اس لیے کہ اسلامی تحریکوں کو اصل فکر اپنے گھر کے حالات درست کرنے کی ہے ۔ہمارے پاس سیاسی نظام اور معاشرے کی تشکیل نو کا ایک واضح پروگرام ضرور ہے 'ہمارا مقصد مسلم معاشرہ کی تعمیر نو ہے ۔

جیسا میں نے کہا 'ہماری بنیادی کوششیں اپنے گھر کے حالات کو بہتر بنانے پر مرکوز ہیں ۔اس ضمن میں کئی عوامل ہمارے موجودہ مسائل پر روشنی ڈالتے ہیں: (۱) نو آبادیاتی دور کے باقی ماندہ اثرات ۔ (۲) مسلم ممالک میں ایسی قیادت جن کے مفادات مغرب کے بعض عناصر کے مفادات سے مطابقت رکھتے ہیں ۔ (۳) گذشتہ چالیس برسوں میں مسلم دنیا کی سیکولر قیادت کی اپنے معاشرے کی خدمت ' اپنے عوام کی تمناؤں کی تکمیل ' ان کے سامنے جواب دہی ' اور ان کے لیے آزادی اظہار ' حقوق انسانی اور سیاسی عمل میں شرکت کی فراہمی میں ناکامی ۔

ہم مسلم دنیا میں اس قسم کی قیادت کے خلاف کھڑے ہیں ۔مغرب کو یہ سوچنا چاہیے کہ مسلم دنیا کی ایسی سیکولر ' بدعنوان اور آمرانہ حکومتوں کے ساتھ ' جن کا زوال لازمی ہے ' وابستگی کہاں تک مغرب کے مفاد میں ہے ۔آخر مغرب کو ان اسلامی تحریکوں سے کیوں الرجی ہو جو اپنے اپنے ملکوں میں آمرانہ حکومتوں کے خلاف نبرد آزما ہیں ۔

کوئی مسلمان ملک 'کوئی مسلمان قوم 'کوئی اسلامی تحریک یورپ 'چین ' جاپان ' امریکہ یا کسی اور ملک کے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے ۔ہم تو صرف اپنی مملکتوں کی آزادی چاہتے ہیں تاکہ ہمارے عوام کی مرضی اور مفادات صاف ستھرے سیاسی عمل کے ذریعے حاصل کیے جا سکیں ۔جہاں تک مغربی ممالک کے اسٹریٹیجک مفادات کا تعلق ہے ' خواہ یہ تیل ہو یا بری ' بحری اور فضائی راستے ہوں ' خام مواد ہو یا ضروری اشیا اور بین الاقوامی تجارت ہو ' ہم چاہیں گے کہ تبادلہ خیال ہو تاکہ ان امور میں تنازعات گفت و شنید سے طے کیے جا سکیں ۔

خود مغرب کے اندر تنازعات موجود ہیں ۔امریکہ اور یورپی برادری میں کئی مسائل پر شمنی ہوئی

ہے، اور بعض اقتصادی امور پر امریکہ اور جاپان میں ناخوش گواری ہے۔ جنوبی اور شمالی امریکہ میں اور امریکہ اور کینیڈا میں بھی مسائل ہیں۔ ان تمام مسائل کو حل کرنے کے لیے بات چیت، تبادلہ خیال اور ایک دوسرے کے موقف کے لیے گنجایش پیدا کرنے کی کوششیں کی جارہی ہیں، اور کامیابی کے روشن امکانات ہیں۔ یہی حکمت عملی مسلم دنیا کے ساتھ کیوں نہیں آزمائی جاسکتی۔ یہ کیوں ضروری ہے کہ تیل کے ذخائر پر براہ راست فوجی کنٹرول ہو۔ کیا مغربی ممالک کو تیل کی فراہمی برقرار رکھنے کا صرف یہی ذریعہ ہے؟ تیسری دنیا کے ممالک کو بھی، بشمول مسلم ممالک کے، یہ حق ہونا چاہیے کہ اپنی اشیا کے لیے مغربی مارکیٹ میں جگہ حاصل کرسکیں۔ مفادات دو طرفہ ہیں، جن کی تفصیل طے کی جانا چاہیے۔

اسلام اور جمہوریت

اسلامی تحریکوں پر مطلق العنانیت اور فاشسٹ ہونے کا الزام بھی لگایا جاتا ہے۔ ہمیں ان الزامات کا غیر جانب داری اور انصاف پسندی کے ساتھ جائزہ لینا چاہیے۔

یقیناً مغربی جمہوریت کے بارے میں فلسفیانہ اور اخلاقی سطحوں پر ہمارے بعض سوالات اور تحفظات ہیں: جدید سیکولر جمہوریت، تصوراتی لحاظ سے دیکھا جائے تو انسان کے مقتدر اعلیٰ ہونے کے اصول پر قائم ہے۔ اس کے برخلاف اسلام اللہ تعالیٰ کو مقتدر اعلیٰ اور انسان کو اس کا نائب تسلیم کرتا ہے، وہ زمین کا مالک و مختار نہیں ہے۔

جہاں تک ہدایت الٰہی کا اور اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے قوانین کا تعلق ہے، وہ بالادست ہیں۔ انسان کی آزادی، اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی حدود کے اندر ہے۔ اسلام کا ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ اس کی حدود میں قانون کی بالادستی کا اصول رائج ہوگا۔ یہی جمہوریت کا اصل الاصول ہے۔

اسلام میں حقوق انسانی کسی صاحب اختیار کی طرف سے دی گئی رعایتیں نہیں ہیں، بلکہ ان کی ضمانت خود اللہ تعالیٰ نے دی ہے، اور اسی حیثیت میں وہ اسلامی نظام کا لازمی حصہ ہیں۔ اسلام، مشاورت سے اجتماعی امور طے کرنے کے اصول کو سیاست، معاشرت، ہر مقام اور ہر سطح پر، مرکزی مقام دیتا ہے۔ مثال کے طور پر، پاکستان کی اسلامی تحریک پہلے ہی دن سے بالغ رائے دہی اور مرد عورت، مسلم غیر مسلم، معاشرے کے ہر فرد کے لیے ووٹ کے حق کی علم بردار ہے۔ ہم نے تو یہاں تک کہا ہے کہ جب قانون سازی کا بنیادی ماخذ قرآن و سنت ہونا طے کرلیا جائے، تو ہر مذہب کے ماننے والے صوبائی اور مرکزی اسمبلیوں میں منتخب کیے جاسکتے ہیں۔

یہ بات تسلیم کی جانی چاہیے کہ اسلامی تحریک نے، بالواسطہ یا بلاواسطہ، نمایندہ سیاسی اداروں اور انتخابی عمل کے ذریعے حکومت کی عوام کے سامنے جوابدہی کے اصول کو تسلیم کیا ہے۔ مقننہ اور

انتظامیہ ' اللہ کی حاکمیت ' شوریٰ اور جواب دہی کے اصولوں کی بنیاد پر جو طریقے مناسب سمجھیں اختیار کر سکتی ہیں ' خواہ انھیں کوئی بھی نام دیا جائے۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہوا ' جمہوریت کی فلسفیانہ بنیادوں کے بارے میں ہمارے تحفظات ہیں۔ لیکن جہاں تک جمہوری عمل کا تعلق ہے ' اسلامی تحریک اسے تسلیم کرتی ہے۔ مغرب کے بہت سے لوگ اسلامی تحریک کے جمہوری ذرائع سے منتخب ہونے پر خطرے کی جھنڈی بلند کر دیتے ہیں۔ یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ اگر الجیریا ' یمن ' ترکی ' اور پاکستان میں اسلامی تحریک کامیاب ہوئی تو یہ آیندہ انتخابی عمل کو نہ چلنے دے گی۔ اس طرح کے الزامات اور اندیشوں کا کوئی جواز یا بنیاد نہیں ہے۔

امر واقعہ تو یہ ہے کہ ترکی ' الجیریا اور پاکستان میں اور دوسرے ملکوں میں سیکولر قیادت نے جمہوری عمل کو سبوتاژ کیا ہے ' نہ کہ اسلامی تحریک نے۔ مصر میں سیکولر مطلق العنان حکمرانوں نے ' مغربی جمہوریتوں کی مکمل حمایت سے ' جمہوری عمل کو سبوتاژ کرنے میں کسی تکلف سے کام نہیں لیا۔ حال ہی میں الجیریا میں یہی کچھ ہوا ہے۔ لیکن مغرب میں کسی نے الجیریا میں فوج کی ' انتخابات میں دھاندلی کرنے پر مذمت نہیں کی۔ اسی طرح مغرب کو آمریت پر ' مثلاً انڈونیشیا میں ' فلپائن میں اور ہیٹی میں ' کوئی اعتراض نہیں ہے ' جب تک وہ ان کے مفادات پورا کرتی رہے۔ اس پر ہمیں سب سے زیادہ پریشانی ہے۔ جب مغرب ہمارے ممالک میں جمہوریت کی دہائی دیتا ہے تو ہم قدرتی طور پر محتاط ہو جاتے ہیں۔ حقیقی جمہوری حکومتوں کی حمایت کرنے میں مغرب کی پالیسی یکساں نہیں ہے۔

دہشت گردی

ایک اور مسئلہ تشدد اور دہشت گردی کا ہے۔ کوئی بھی شخص ' خصوصاً وہ جو دنیا کے بارے میں اخلاقی نقطہ نظر رکھتا ہے ' دہشت گردی کو جائز نہیں سمجھتا۔ قرآن کہتا ہے کہ ایک آدمی کو ناحق قتل کرنا ایسا ہے جیسے سارے انسانوں کو قتل کرنا ' اور ایک بے گناہ کی جان بچانا ایسا ہے جیسے پوری انسانیت کو بچا لینا (المائدہ ۵: ۱۹)۔ یہی میرا ایمان ہے۔ اسلام دہشت گردی کی نہ اجازت دیتا ہے اور نہ حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ ہمیں حیرانی مغرب کے اس رویے پر ہوتی ہے کہ دہشت گردی کے اصل اسباب اور واقعات کی تفتیش کیے بغیر ' یا محض اکا دکا واقعات کی بنیاد پر ' تمام مسلمانوں اور اسلامی تحریکات کو دہشت گرد قرار دے دیا جاتا ہے۔ جب اسلامی تحریکوں کو ریاستی ظلم و ستم کا سامنا کرنا پڑتا ہے ' تو مغرب اسے دہشت گردی قرار دے کر اس کی مذمت نہیں کرتا۔ گذشتہ ۴۰ برسوں میں اسلامی تحریکیں ریاستی دہشت گردی کے مختلف مراحل سے گزری ہیں ' جو مغرب کے دوست سیکولر حکمرانوں نے کیں۔ اہل کشمیر کا حق خود ارادیت ایک اور مثال ہے۔ غیر وابستہ تحریک نے یہ تسلیم کیا ہے کہ اگر کوئی قوم آزادی یا

خود ارادیت کا انتخاب کرتی ہے ' خواہ اس کے لیے طاقت استعمال کرنا پڑے ' تو اسے دہشت گرد قرار نہیں دیا جاسکتا۔ پھر بھی کچھ لوگوں نے خصوصاً انڈیا میں رہنے والوں نے اہل کشمیر پر دہشت گردی کا الزام رکھا ' حالانکہ کشمیر ایک متنازعہ علاقہ ہے۔ اور اقوام متحدہ کی قرار دادوں کے مطابق اس کے باشندوں کو اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنا باقی ہے۔

دہشت گردی انفرادی عمل ہے اور اجتماعی بھی۔ یہ مشرق میں ' مغرب میں ' اور دنیا میں ہر جگہ ہو رہا ہے۔ کل ہی میں فلوریڈا کے بارے میں ایک اخباری رپورٹ پڑھ رہا تھا ' جس میں گذشتہ سال کے دوران قتل ' آبروریزی اور مجرمانہ حملوں کے ۴۲ ہزار دو سو واقعات کا ذکر ہے۔ نیویارک کا ریکارڈ دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسی طرح کے واقعات کراچی ' بمبئی اور تیسری دنیا کے دوسرے شہروں میں ہو رہے ہیں۔ ہمیں اس پر دکھ ہے ' لیکن ایسا کیوں ہے کہ جب اسلام اور مسلمانوں کا معاملہ آتا ہے ' تو ایک مجموعی رویہ اپنا لیا جاتا ہے۔ ہم سب کو اس بات سے اتفاق ہونا چاہیے کہ جہاں کہیں بھی دہشت گردی ہے ' اس کے دیرپا حل تلاش کرنے کے لیے ہمیں ان حالات کو سمجھنا چاہیے۔

آخر میں اپنی گفتگو ختم کرتے ہوئے ' میں آپ کو دعوت دوں گا کہ آپ اسلامی تحریکوں کے بارے میں اسی حیثیت سے غور کریں کہ ' یہ قابل لحاظ اجتماعی مذہبی اخلاقی تحریکیں ہیں ' جن کا نصب العین اپنے معاشروں کی تشکیل نو ہے۔ جان اسپوزیٹو (Esposito) اور بعض دوسرے اہل علم نے بجا طور پر نشاندہی کی ہے کہ اسلامی تحریکوں کے اندر بھی تنوع پایا جاتا ہے۔ ان سب کو ایک قرار دینا غلطی ہے۔ اسی طرح مغرب بھی ایک ہم آہنگ اکائی نہیں ہے۔ اس میں متعدد گروپ ' مختلف آرا ' رویے اور رجحانات شامل ہیں۔ مغرب کے کچھ لوگ اسلامی تحریکوں کو ' بلکہ اسلام کو ' ایک نئے آسیب کے طور پر پیش کر رہے ہیں ' جو سرد جنگ کے اختتام پر کمیونزم کے زوال کے بعد بین الاقوامی دشمن کی شکل میں سامنے آیا ہے۔ مغرب میں ہی ایسے دوسرے لوگ ہیں جو اس نقطہ نظر پر تنقید کر رہے ہیں اور اسلام اور مسلمانوں کو سمجھنے کے لیے زیادہ معقول اور شائستہ رویہ اپنانے کے داعی ہیں۔ اس لیے یک رخے رویے کو ترک کرنا یقیناً دانش مندی کی بات ہوگی۔

میں یہ بھی عرض کروں گا کہ اسلامی تحریکیں ابھی نشوونما کے دور سے گزر رہی ہیں اور انھوں نے ارتقائی مراحل طے کیے ہیں۔ تسلسل ان کا بنیادی وصف ضرور ہے ' مگر وہ مختلف بھی ہیں۔ ان میں لچک ہے ۔ لیکن وہ اصولوں پر سمجھوتہ نہیں کرتیں ' وہ اپنی تدابیر ' حکمت عملی ' طریق کار اور بر سر زمین پیش آمدہ مشکلات کے مناسبت سے معاملات میں نہایت لچک دار ہیں۔

میں اس بات پر بھی زور دینا چاہوں گا کہ وہ مغرب سے مکالمہ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ کسی گھمنڈ میں

مبتلا نہیں ہیں' نہ وہ دنیا سے الگ تھلگ رہنا چاہتے ہیں۔ انھیں اس کا ادراک ہے کہ دنیا ایک عالمی بستی بنتی جا رہی ہے۔ ہمیں زندہ رہنا ہے' اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہم سب اپنے علمی' سیاسی معاشی اور اجتماعی مسائل میں انسانی رویے اپنائیں۔

میں کامل انکساری سے یہ بھی عرض کروں گا کہ اسلام نے آغاز ہی سے دنیا اور اس کے لوگوں کے ساتھ کثیر جہتی رویہ اپنایا ہے۔ قرآن کا یہ دعویٰ ہے کہ وہی الحق ہے' لیکن وہ یہ بھی کہتا ہے کہ تمام پیغمبر یہی پیغام لے کر آئے تھے' خواہ قرآن میں ان کے نام آئے ہوں' یا نہ آئے ہوں۔ خدا نے لوگوں کو یہ آزادی دی ہے کہ وہ اس کے وجود کا انکار کر دیں' اور جو اس کے وجود کا انکار کریں' دنیا میں زندہ رہنے کا ان کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا کہ انکار نہ کرنے والوں کا' گو کہ اسلامی نقطہ نظر سے وہ آخرت میں اپنے کیے کا خمیازہ بھگتیں گے۔ اس طرح اسلامی رویہ 'کثیر الجہت رویہ ہے۔ اسلام اہل کتاب' یعنی عیسائیوں اور یہودیوں کی مسلمانوں سے قربت کو' اور کم سے کم دو معاملات میں خصوصی تعلقات کو' تسلیم کرتا ہے۔ شادی اور ہم طعامی۔ اسلام اس امر واقعہ کو تسلیم کرتا ہے کہ اہل کتاب خاتون مسلمان خاندان کی رکن ہو سکتی ہے اور اسے مذہب تبدیل کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔ اہل کتاب اگر اپنی دینی روایت پر قائم ہوں تو ان کے ساتھ کھانا کھانے کی بھی اجازت ہے۔ یقیناً یہ اسلام کے کثیر الجہت رویے کا حصہ ہے۔

میرا خیال ہے کہ سیاسی اور معاشی مسائل کے بارے میں بھی مسلمان کثیر الجہت ہیں۔ اس تصور میں کہ ایک یکساں نظام' تہذیب یا ثقافت دنیا کے معاملات میں غالب کردار ادا کرے' استعماریت کی بو آتی ہے۔ سرد جنگ کے اختتام کا مطلب یک قطبی دنیا کی پیدائش' مغربی آزادروی کی فتح اور نتیجتاً تاریخ کا اختتام نہیں ہے۔ مغربی دنیا کے بعض حصوں میں ہم یہ سن رہے ہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ ہماری طرف سے' اور مغربی ممالک کی طرف سے' زیادہ کثیر الجہتی رویہ شاید دنیا کو رہنے کے لیے بہتر جگہ بنا دے گا۔ میں اس راؤنڈ ٹیبل کو یہی پیغام دینا چاہوں گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا!

اللہ تعالیٰ ظالم کو مہلت دیتے ہیں یہاں تک کہ مہلت عمل ختم ہو جاتی ہے۔ پھر اسے اس طرح پکڑتے ہیں کہ چھوڑتے نہیں۔ پھر آپ نے یہ آیت پڑھی۔

ترجمہ + اور تیرے رب کا پکڑنا اسی طرح سے ہے جب وہ بستی والوں کو پکڑتے ہیں' درآنحالیکہ وہ ظالم ہوتے ہیں۔ (متفق علیہ)

ٹیم ورک : تعارف اور ضرورت

محمد بشیر جمعہ

یہ مضمون دفتری' کاروباری اور معاشرتی انداز کو پیش نظر رکھتے ہوئے لکھا گیا ہے۔ تنظیم' دعوت' سیاست' اجتماعی منصوبوں کے تناظر میں اصطلاحات کو تبدیل کر کے پڑھنے کی کوشش کیجیے' سوچ کے راستے سامنے آئیں گے۔ (مدیر)

سبق حاصل کیجیے

۱۔ شہد' اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے' اس میں شفا ہے۔ مگر شہد کی تیاری ایک بے حد محنت طلب کام ہے۔ آدھے کلو کے قریب شہد تیار کرنے کے لیے شہد کی مکھیوں کو تین لاکھ میل تک کا سفر طے کرنا پڑ سکتا ہے۔ ایک مکھی کی عمر چند مہینے سے زیادہ نہیں ہوتی' اس لیے کوئی ایک مکھی تنہا آدھا کلو شہد تیار نہیں کر سکتی' خواہ وہ اپنی عمر کا ہر لمحہ پھولوں کا رس جمع کرنے میں لگا دے۔ یہ مشکل کیسے آسان ہوئی؟ مکھیوں نے مل کر' منظم ہو کر' ایک ہو کر' شہد بنایا۔ شہد کی تیاری کو اللہ تعالیٰ نے ایک بے حد وسیع اور پیچیدہ نظام سے وابستہ کر دیا۔ اس حیرت انگیز نظام کے اندر انسان کے لیے بے شمار سبق ہیں۔ ایک بڑا سبق ہے "ٹیم ورک"۔ یہ قدرت کا سبق ہے۔ کچھ کام ایسے ہیں جن کو ہر آدمی کم وقت میں اپنی ذاتی کوشش سے انجام دے سکتا ہے' مگر کچھ کام ایسے ہوتے ہیں جن کو کوئی شخص تنہا انجام نہیں دے سکتا۔ ایسے کام کو واقعہ بنانے کی واحد ممکن شکل وہی ہے جو شہد کی مکھی کی مثال میں نظر آتی ہے۔ یعنی بہت سے لوگ مل کر' ایک بن کر' اسے انجام دیں۔ (راز حیات' مولانا وحید الدین خان)

۲۔ چند سالوں ہی کی بات ہے' امریکہ اور آسٹریلیا کے بحرالکاہلی ساحلی شہروں کے درمیان خط و کتابت کی ترسیل میں کافی وقت لگتا تھا۔ تین دوستوں نے' جن کے نام انگریزی حروف ڈی' ایچ' ایل سے شروع ہوتے تھے' سوچا کہ وہ بھیجنے والے سے خط لے کر' خود جلد از جلد مخاطب تک پہنچائیں۔ انھوں نے ایک ٹیم بنا کر اپنے تخیل کو قابل عمل بنا دیا۔ اس مشکل کو آسان کر دیا۔ جو طریقہ کار انھوں

نے وضع کیا' وہ اب کوریر سروس کے نام سے مشہور ہے۔

۳۔ ۱۹۸۶ میں شارجہ کپ کے ون ڈے میچ میں پاکستان کو بھارت کے مقابلے میں جیتنے کے لیے چار رنز درکار تھے اور بس دو گیندیں باقی تھیں کہ توصیف احمد نے ایک رن لے کر جاوید میاں داد کو آخری بال کھیلنے کا موقع دیا۔ اسی آخری بال پر شارجہ کا چھکا ایک محاورہ بن گیا اور پاکستان یہ میچ جیت گیا۔ یہ کام لاجواب ٹیم سپرٹ نے کر دکھایا۔

۴۔ دو کہانیاں ہم سب بچپن میں ہی پڑھتے اور سنتے آئے ہیں۔ ایک یہ ہے: ایک بزرگ کا انتقال ہو رہا تھا۔ انھوں نے لکڑیوں کا گٹھا منگوا کر اپنے بیٹوں کو دیا کہ اسے توڑ دو مگر کوئی بیٹا نہیں توڑ سکا۔ پھر انھوں نے لکڑیاں الگ الگ کر دیں۔ اب وہ آسانی کے ساتھ توڑ دی گئیں۔ یوں بزرگ نے اپنی اولاد کو اتحاد کی نصیحت اور وصیت کر دی۔ کہانی سب کو معلوم ہے مگر ہمارے ملک میں اس کہانی پر عمل کتنا ہو رہا ہے' وہ بھی سب کو معلوم ہے۔ ہم الگ الگ لکڑیاں ہیں' جو توڑی جا رہی ہیں۔

دوسری کہانی یوں ہے۔ ایک عمارت میں آگ لگ گئی' لوگ اپنی اپنی جانیں بچا کر بھاگنے لگے۔ عمارت میں دو معذور افراد بھی تھے۔ ایک لنگڑا' دوسرا نابینا۔ ان دونوں نے اپنی کمزوریوں سے مصالحت کر کے اور آپس میں مل کر جان بچائی۔ نابینا کے کاندھے پر لنگڑا سوار ہو گیا' اور وہ نابینا کی راہ نمائی کرتا گیا' اس طرح دونوں اس آگ سے نکل گئے۔ کاش ہمارے ملک کے لوگ موجودہ آگ سے نکلنے کے لیے ان معذوروں کے عمل ہی سے فائدہ اٹھائیں۔

اس آگ کو ٹھنڈا کون کرے؟

ہم ٹیم ورک کے موضوع پر بات کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے کہ دفتر' کارخانے' کاروبار' تعلیمی اداروں' بلدیاتی سیاست' قومی سیاست' کھیل' فوج' دعوت و تبلیغ اور اجتماعی امور' غرض زندگی کے ہر میدان میں جہاں جمع ہو کر لوگ کام کرتے ہیں' کامیابی اور اہداف کا حصول ٹیم ورک کے بغیر ممکن نہیں۔ ہر جگہ آگ سے بچنے کے لیے وہ دو معذور کہہ رہے ہیں کہ ہمیں دیکھو' ہم سے سبق لو' اپنے آپ کو بچاؤ۔ لوگ کام کے لیے جمع تو ہو جاتے ہیں' ایک نہیں بنتے' ٹیم نہیں بنتے' اس لیے کچھ بھی حاصل نہیں ہو رہا۔ ہمیں نہ صرف اہداف حاصل کرنا ہیں' اپنی جان بچانی ہے۔ بلکہ اس آگ کو بھی بجھانا ہے جو کسی نے پٹرول پھینک کر کسی نے تیلی پھینک کر بھڑکائی ہے اور مزید پٹرول چھڑکا جا رہا ہے۔

تین قسم کے افراد

ہر معاشرے میں کام کرنے والے افراد تین قسم کے ہوتے ہیں: ایک وہ جو کسی کے ماتحت ہی کام

کرنا پسند کرتے ہیں اور اسی میں اپنی عافیت سمجھتے ہیں۔ دوسرے وہ جن کے مزاج میں حاکمیت ہے اور وہ ہمیشہ لوگوں کو زیر کر کے ہی کام کرنا پسند کرتے ہیں۔ تیسری قسم ان افراد کی ہے جو ہر صورت حال میں لوگوں کے ساتھ مل کر اونچ نیچ کے ساتھ کام کر لیتے ہیں۔

ہمارے ملک میں بڑی تعداد پہلی قسم کے افراد کی ہے۔ اس کی وجہ ہمارا نظام تعلیم اور دو سو سالہ غلامی ہے۔ نظام تعلیم اور غلامی نے ہماری اکثریت کو غلاموں کی طرح کام کرنے کی عادت ڈال دی ہے۔ وہ مزاجاً اتنے ماتحتی پسند ہو گئے ہیں کہ ہر وقت ''صاحب کا حکم'' سننے کے انتظار میں رہتے ہیں۔ دوسری قسم کے لوگ پہلی قسم سے بہت کم ہیں، مگر جو ہیں وہ ذہناً اور مزاجاً اتنے آگے بڑھے ہیں کہ انھیں ہر ماتحت کو، پوری قوم کو غلام بنا کر رکھنا ہے۔ ایک سرکاری دفتر میں، جہاں ہر کمرے میں انٹرکام لگے ہوئے تھے، ایک درجہ بڑے صاحب نے اپنے ماتحت کو چپڑاسی کے ذریعے بلایا، اور جب وہ آیا تو اس سے کہا کہ وہ مطلوبہ فائل لے آئے۔ اب دیکھیے، اس ذہنیت کو! وہ انٹرکام فون پر بھی کہہ سکتے تھے، چپڑاسی سے بھی کہلوا سکتے تھے کہ فلاں فائل لے آؤ، مگر چپڑاسی سے بلائے بغیر وہ اپنے آپ کو صاحب کیسے ظاہر کریں۔ بدقسمتی سے اہل منصب حضرات کو اسی چیز کا خمار چڑھا ہوا ہے۔ گھروں میں، دفتروں میں، مسجدوں میں، حکومت میں۔ اسی خمار کو لوگ آمریت، بیوروکریسی اور جاگیرداری کہتے ہیں۔

افراد کی تیسری قسم، درحقیقت ہمیں مطلوب ہے، مگر اس کا شدید فقدان ہے۔ ٹیم اسپرٹ کے ساتھ کام کرنے کا تصور ابھی تک لوگوں تک پہنچا ہی نہیں، اور اگر پہنچا ہے تو لوگوں نے قبول نہیں کیا ہے۔ صاحب سمجھتے ہیں کہ ماتحت کام کریں گے، ماتحت کہتے ہیں کہ ہمیں کیا پڑی ہے، ہمارا کیا بگڑے گا، ہماری تنخواہ بھی کم ہے، بس جتنی تنخواہ اتنا کام، ہم کام کیوں کریں۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان ہر لمحے، ایک قدم پیچھے جا رہا ہے، ہر لمحے بگاڑ بڑھ رہا ہے، اہداف پیچھے جا رہے ہیں، ہم ہر لمحے، آیندہ نسلوں کو لاکھوں روپے کا مقروض کر رہے ہیں۔ درحقیقت ہمیں اس وقت ہر شعبے میں ٹیم ورک کی شدید ضرورت ہے۔

مل کر بھونکنا اور ھڈی کے لیے لڑنا

ہمارے ہاں جذباتی قسم کا ٹیم ورک تو خوب نظر آتا ہے۔ یعنی کوئی دشمن آجائے تو مل کر اسے بھگانے کی کوشش کرتے ہیں، کوئی مر جائے تو مل کر تجہیز و تکفین و تدفین کر لیتے ہیں مگر کسی ہدف کے لیے مل کر کام کرنے کا تصور موجود نہیں۔ ایک صاحب نے ہم لوگوں کے بارے میں عجیب سی مثال دی۔ مثال بری ہے، مگر حقیقت کو تسلیم کرنا بھی عظمت ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہماری مثال تو کتوں کی

طرح کی ہے۔ جب کوئی اجنبی نظر آتا ہے تو سب مل کر بھونکتے ہیں، اور جب کوئی ہڈی پھینکتا ہے تو آپس ہی میں لڑنا شروع ہو جاتے ہیں۔ آپ زندگی کے مختلف شعبوں میں دیکھیے، آپ کو ہر جگہ آئینہ نظر آئے گا۔ کاروبار نقصان میں ہے، سب مل کر قربانی دیتے ہیں۔ جہاں نفع آنا شروع ہوا، وہاں شرکا آپس میں لڑنے لگے۔ یونین سازی، دفتری مسائل اور ملکی و قومی سیاست، ہر جگہ بھونکنا اور ہڈی کے لیے لڑنا نظر آتا ہے۔

ٹیم ورک کی ضرورت

مل کر اور ٹیم بن کر کام کرنا قربانی کے بغیر ممکن نہیں، قربانی کی قیمت ہوتی ہے، اور وہ قیمت صبر ہے۔ آدمی کے لیے اپنے اندر اٹھنے والے منفی جذبات کو ختم کرنا اور قابو میں رکھنا، یہی وہ چیز ہے جو ہر اجتماعی عمل کو ممکن بناتی ہے۔ مل کر کام کرنے میں اصل رکاوٹ یہ ہے کہ افراد کی اپنی شخصیت اس میں نہیں ابھرتی، ان کے مفادات پورے نہیں ہوتے، انھیں مطلوبہ جاہ و مال حاصل نہیں ہوتا۔ جہاں افراد کی نظر میں اپنی شخصیت اور اپنے مفادات کو ترجیح ہو سکتی ہے، وہ افراد کبھی اجتماعی عمل میں کامیاب نہیں ہو سکتے، اور اسی لیے وہ کوئی بڑی ترقی بھی نہیں کر سکتے۔ بڑی ترقی حاصل کرنے کا سب سے آسان طریقہ اتحاد ہے۔ اتحاد ایک کو کئی گنا بنا دیتا ہے، وہ کوشش کی مقدار کو کئی گنا زیادہ کر دیتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ ایک اور ایک دو نہیں ہوتے بلکہ گیارہ ہوتے ہیں۔

جب ٹیم ورک کی اہمیت کے بارے میں دفتری اور کاروباری حوالے سے گفتگو ہوتی ہے، تو چند لوگ کہتے ہیں کہ بعض اوقات ٹیم بنانے سے وہ قوت پیدا نہیں ہوتی جو مطلوب ہوتی ہے، کیونکہ لوگ دوسروں پر کام ٹالتے اور ڈالتے ہیں۔ جیسے، اگر آپ ایک میز اٹھا رہے ہیں، آپ کے ساتھ آپ کا ماتحت ہے، بظاہر آپ دو حضرات مل کر میز اٹھا رہے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ آپ نے تو ہلکے انداز سے میز پکڑی ہوئی ہے جبکہ اصل وزن ماتحت پر آ رہا ہے۔ اس مزاج کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ آیئے، اب مثبت اور منفی پہلوؤں کو پیش نظر رکھتے ہوئے گفتگو کریں۔

ٹیم اور ٹیم ورک کیا ہے؟

۱۔ ٹیم کسی گفتگو کی مجلس یا باہمی ملاقات کے کلب کا نام نہیں، بلکہ یہ کسی مفوضہ کام کرنے کے لیے جمع ہو جانے کا نام ہے۔ جو کام انفرادی طور پر ناممکن ہوتا ہے، وہ گروپ کی صورت میں ممکن بنایا جاتا ہے۔ کیونکہ ٹیم کے ذریعے مجموعی کام اور نتائج روایتی انداز کے ذریعے کام کرتے ہوئے انفرادی کام اور نتائج کے مجموعے سے زیادہ ہوتے ہیں۔ ٹیم، صلاحیتوں کو مجتمع کر کے ان سے کئی گنا فائدہ

اٹھانے، اور ایک دوسرے کی کمزوریوں اور کمیوں کو پورا کرنے اور ان کا ازالہ کرنے کے لیے منظم کی جاتی ہے۔

۲- ٹیم کے ارکان کی خصوصیات میں آپس میں انحصار شامل ہے۔ ٹیم ورک میں ہر شریک حصہ دیتا ہے، ہر شریک حصہ لیتا ہے۔ اپنے حصے کا کام کرتا ہے، ساتھی کی مدد کرتا ہے، ٹیم کے منصوبے کے مطابق کرتا ہے، اپنے کام کو دوسروں کے کام کے ساتھ مربوط رکھتا ہے۔ ہر شریک ٹیم ورک کے فوائد سے حصہ لیتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے فوائد سے صنعت، معیشت، معاشرہ، دعوت و تنظیم اور مملکت کو بھی فائدہ پہنچتا ہے۔

۳- ٹیم کے لیے اپنی افادیت اور کارگزاری کا باقاعدہ جائزہ لینا بھی ضروری ہے۔ یہاں معلومات راز میں نہیں رکھی جاتیں بلکہ احساس شرکت کے ساتھ باہمی اعتماد کے ذریعے حفظ مراتب کا احترام کرتے ہوئے کام کیا جاتا ہے۔

۴- ٹیم کے ذریعے اچھے اور صحیح فیصلوں پر پہنچنے میں مدد ملتی ہے۔ مارکیٹنگ کا شعبہ ہو، پیداوار کا یا دعوت و تبلیغ کا۔ جہاں اجتماعی طور پر کام ہو رہا ہو وہاں فیصلوں میں سب کی شرکت کے باعث ترقی کی راہیں کھلتی رہتی ہیں۔

۵- ٹیم کے ذریعے مستقبل کے مسائل کا زیادہ صحیح اندازہ لگایا جاتا ہے، اور ان کے سدباب یا حل کے لیے بہتر منصوبہ بندی اور کوشش کی جاتی ہے۔

۶- اعلیٰ افسران اور صاحب منصب حضرات عموماً ٹیم ورک کی مخالفت کرتے ہیں کیونکہ اس وجہ سے انھیں اپنی افادیت میں کمی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ ان کی عدم صلاحیت اور کم قابلیت کے باعث وہ احساس تحفظ کے نفسیاتی مریض بن جاتے ہیں اور انھیں ہر وقت یہ ڈر رہنے لگتا ہے کہ کہیں ٹیم ورک کے ذریعے کوئی متبادل یا موثر شخصیت نمودار نہ ہو جائے یا ان کی شخصیت نظروں سے اوجھل نہ ہو جائے۔

۷- ٹیم سے بعض اوقات فوری فوائد حاصل ہو جاتے ہیں مگر عموماً یہ فوائد لمبی مدت میں حاصل ہوتے ہیں۔ یہ لمبی مدت چھ ماہ سے دو سال کے عرصے پر محیط ہوتی ہے۔ اس ٹیم ورک کے ذریعے انقلاب نہیں لایا جاتا بلکہ تبدیلی لائی جاتی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ تبدیلی کا عمل وقت لیتا ہے۔

۸- ٹیم میں شرکا کی حیثیت سے ملازمین، افسران، مزدور اور سپروائزر یعنی مختلف مراتب کے افراد شامل ہوتے ہیں۔ انھیں آپس میں ایک دوسرے کو سمجھنے اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ٹیم ورک کے لیے اختلافات کی قربانی کی ضرورت ہوتی ہے۔

۹- ٹیم میں نہ تو آمرانہ انداز میں فیصلے ٹھونسے جاتے ہیں اور نہ ہی جمہوری انداز میں سر اور ٹانگیں گنی جاتی ہیں بلکہ اتفاق رائے سے فیصلے کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ٹیم کے ذریعے باہمی ہم آہنگی پیدا کی جاتی ہے اور اجتماعی اختلافات کو ختم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

۱۰- ٹیم ورک عموماً وسعت کے ماحول میں ہوتا ہے' جہاں لوگ زیادہ ہوں' فکر' تخلیق اور اظہار رائے کی آزادی ہو۔ گھٹن اور سخت کنٹرول کے ماحول میں یہ کام نہیں ہوتا۔ مثلاً فٹ بال' ہاکی' باسکٹ بال اور کرکٹ کے میدانوں میں کھلاڑیوں کے لیے ٹیم ورک میں آسانی ہوتی ہے اور یہ کارآمد بھی ہوتا ہے۔ مگر ٹیبل ٹینس' شطرنج اور دیگر انڈور گیمز میں یہ کام زیادہ مفید نہیں ہوتا۔ اسی طرح پیداوار' مارکیٹنگ اور دعوت و تبلیغ کے شعبوں میں یہ کام انتہائی بہتر انداز سے ہو سکتا ہے' جبکہ فنانس اور اکاؤنٹ کے شعبوں میں کنٹرول اور طریقہ کار کی پیچیدگیوں اور قیادت کے فقدان کے باعث یہ کام آسانی سے نہیں ہو سکتا۔ بحرانی کیفیت اور ٹارگٹ کے اوقات میں ان شعبوں میں یہ کام کر لیا جاتا ہے' مگر عموماً ٹیم ورک کے مزاج کی کمی ہوتی ہے اور بعض اوقات اس کی ضرورت بھی نہیں ہوتی۔
(جاری)

مصر: انتخابات 'کی تیاریاں'

مسلم سجاد

اخوان المسلمون کے دو سو سے زائد سرکردہ راہ نماؤں کی گرفتاری نے مصر میں مغرب نواز سیکولر حکمرانوں کی جمہوریت کا حقیقی چہرہ دنیا کو ایک دفعہ پھر دکھا دیا ہے۔ اخوان المسلمون ملک کی سب سے بڑی حزب اختلاف ہے۔ ۱۹۸۷ کے انتخابات کے نتیجے میں پیپلز اسمبلی کی ۵۸ ہ نشستوں میں سے ۳۷ اس نے حاصل کی تھیں۔ ۱۹۹۰ کے انتخابات کا 'بیشتر جماعتوں کے ساتھ 'اخوان نے بھی بائیکاٹ کیا تھا۔ اب نومبر میں ہونے والے انتخابات میں اس کی قوت کا اندازہ ایک دفعہ پھر ہونا ہے 'لیکن حسب معمول حکمران اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آئے ہیں۔ حسنی مبارک کی حکمت عملی یہ ہے کہ الجیریا جیسی متوقع صورت حال سامنے آنے سے پہلے ہی معاملے کو سنبھالا جائے۔ ایک معروف اہل قلم محمد سید احمد کے مطابق 'حکومت جانتی ہے کہ اگر خصوصی اقدامات نہ کیے گئے تو یہ (اخوان) معتدل اسلام پسند آخری پارٹی کی حیثیت سے ابھر آنے کی بہترین پوزیشن میں ہیں۔ انتخابات کے متوقع ''یقینی نتائج'' کے باوجود اس دفعہ اخوان نے انتخابات لڑنے کی سنجیدگی سے تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ گذشتہ دو انتخابات میں انھیں خود امیدوار کھڑے کرنے کی اجازت نہ تھی۔ دوسری پارٹیوں کے تحت ان کے امیدواروں نے انتخابات لڑے۔ لیکن اس دفعہ وہ حکومت کے اس فیصلے سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں کہ امیدوار انفرادی حیثیت سے کھڑے ہوں گے۔ گذشتہ سال کے اختتام پر اخوان کے نظم نے مختلف حلقوں کے لیے امیدواروں کا تعین کر لیا تھا۔ لیکن اب ان امیدواروں اور سیکڑوں دوسرے راہ نماؤں کی گرفتاری نے کارکنوں اور عوام میں بے چینی کی لہر دوڑا دی ہے۔

گذشتہ تین سال سے انتہا پسند الجماعۃ الاسلامیہ کو کچلنے کے لیے حسنی مبارک کی حکومت نے قتل و خوں ریزی اور جبر و تعذیب کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ اخوان کے ساتھ نسبتاً نرم رویہ رکھا گیا اور

انھیں کام کرنے کی کچھ آزادی دی گئی ۔ حکومت کا خیال ہے کہ اس نے الجماعۃ کی سرگرمیوں کو محدود کرنے میں کامیابی حاصل کر لی ہے ۔ اب اسے اخوان کا خطرہ نظر آنے لگا ہے ۔ چنانچہ سوڈانی حکومت سے رابطوں کے الزام میں ان کے خلاف سال کے آغا سے ہی کارروائیاں کی جارہی ہیں اور اب جون میں عدیس ابابا میں حسنی مبارک پر قاتلانہ حملے کے بعد' بڑے پیمانے پر ہاتھ ڈالا جا رہا ہے ۔ اسی لیے ایک رائے یہ ہے کہ عدیس ابابا کا ناکام حملہ خود مصری حکومت کا اپنا ہی ڈرامہ تھا۔

مغربی تبصرہ نگار ملک کے خراب معاشی حالات کو اسلامی تحریکوں کی مقبولیت کا سبب بتاتے ہیں ۔ یہ خراب معاشی حالات مغرب کے نمایندوں کی برسوں کی بلا شرکت غیرے مکمل اختیارات کے ساتھ حکومت کا نتیجہ ہیں ۔ ملک کی ۶ کروڑ آبادی میں سے ۹۸ فیصد دریائے نیل کے اردگرد کی زرخیز پٹی پر آباد ہے اور ٹرین کے ایک طویل سفر میں' اندر مسافروں کی بے چارگی اور باہر ۵ ۳ اسٹیشنوں سے گزرتے ہوئے غربت کے مناظر دیکھ کر حالات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے ۔ یہ غریب' آبادی کا ۸۰ فی صد ہیں ۔ ایک خاندان کی اوسط ماہانہ آمدنی ۳۲ پونڈ سے زیادہ نہیں ۔ ایک مزدور کو سارے دن کی مشقت کے بعد ۲ پونڈ سے زیادہ نہیں ملتے ۔ مگر یہ بھی اپنے کو خوش قسمت سمجھتے ہیں اس لیے کہ ۲۰ فی صد بے روزگار ہیں ۔ یہ ایک مصر ہے' دوسرے درجے کے شہریوں کا ۔ اور دوسرا مصر سرکاری اور فوجی افسروں کا اور خوشحال تاجروں کا مصر ہے' جو اول درجے کے شہری ہیں ۔ ایک استاد عبدالمنعم محمد نے کہا: پولیس پیسے والوں اور طاقتوروں کا ساتھ دیتی ہے ۔ ہم اہل اختیار کے پاس جانے سے ہر ممکن گریز کرتے ہیں ۔ کسی کو ان سے انصاف کی امید نہیں ۔

اخوان المسلمون اسی معاشرے میں سرگرم عمل ہیں ۔ ان کی دعوت اللہ کی بندگی کی طرف پلٹنے کی دعوت ہے ۔ وہ گاؤں گاؤں پھیلے ہوئے ہیں ۔ مسجدیں ان کی سرگرمیوں کا مرکز ہیں ۔ جمعہ کی نمازوں کے اجتماع ان کی پیغام رسانی کا سب سے موثر ذریعہ ہیں ۔ ہر مصیبت کے وقت' زلزلہ ہو یا سیلاب' وہ سب سے آگے ہوتے ہیں ۔ انھوں نے ملک بھر میں رفاہی خدمات کا' اسپتالوں کا اور اسکولوں کا جال پھیلا دیا ہے ۔ "یہ مصر کی سب سے موثر اور مقبول عوامی تحریک ہے ۔ اس نے رفاہی کاموں کے ذریعے عوام میں اپنے لیے حمایت حاصل کی ہے ۔ اور عدلیہ' تعلیم' ذرائع ابلاغ اور پیشہ ورانہ تنظیموں سے وابستہ متوسط طبقہ میں اہم مقام حاصل کر لیا ہے ۔ (فنانشل ٹائمز' ۹ اگست ۹۵)

اب جمہوریت نواز' حکمرانوں کو یہ مسئلہ درپیش ہے کہ ان کا راستہ کیسے روکا جائے ۔ ایک نقطہ نظر یہی ہے کہ آہنی ہاتھ سے: جس طرح الجماعت الاسلامیہ کو کچلنے کی کوشش کی گئی ہے ۔ شاید گرفتاریاں بھی اس لیے ہیں کہ اخوان کے نوجوان عناصر جوش سے مغلوب ہو کر نکل آئیں اور پھر

ـ یں اور پھر

حکومتی مشینری ان پر ٹوٹ پڑے۔ فنانشل ٹائمز نے گرفتاریوں پر تبصرہ کی سرخی ہی یہ لگائی ہے Egypt's Islamists: Prescribed or provoked? یعنی انھیں دبایا جا رہا ہے یا چھیڑ کر اکسایا جا رہا ہے؟ حکومت کے ایسے خیرخواہ بھی ہیں، مثلاً سابق چیف جسٹس سعید عشماوی جو مشورہ دے رہے ہیں کہ اخوان کا مقابلہ کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ 'موجودہ اداروں کو مضبوط کیا جائے اور رفاہی خدمات کے دائرے میں جہاں اخوان جگہ بنا رہے ہیں زیادہ کام کیا جائے۔ ایک تھنک فورم کے سربراہ سعید النجار کا کہنا ہے کہ جمہوریت کا التوا حکومت کی بدترین سیاسی غلطی ہوگی۔ ہر سطح پر عوام کی سیاسی شرکت سے ہی اخوان کو شکست دی جا سکتی ہے۔ کتنی ہی گرفتاریاں کر لی جائیں، اخوان کے اثر و نفوذ میں اضافہ ہی ہو گا۔

خود اخوان کے اندر بھی اعتدال پسندی اور انتہا پسندی کی بحث ہے۔ حکومت کے سخت گیر اقدامات اعتدال پسندی کے موقف کو کمزور کرتے ہیں۔ الجماعۃ میں اخوان کے ایسے سابق لوگ بھی ہیں جو اس کی حکمت اختیار کرنے کی پالیسی سے غیر مطمئن ہو کر ادھر چلے گئے۔ قاہرہ میں کئی مبصر کہہ رہے ہیں کہ حکومت کے یہ اقدامات معتدل بنیاد پرستوں کو تشدد کی طرف دھکیل دیں گے۔ الاہرام میں معروف کالم نگار فہمی ہویدی نے لکھا ہے کہ ''حکومت وہی غلطی کر رہی ہے جو الجیریا میں ۱۹۹۲ کا الیکشن منسوخ کر کے کی گئی تھی۔ مرشد عام حامد ابو النصر اور نائب مصطفیٰ المشہور کے بعد متوقع جانشین ابراہیم ظفرانی اور عصام اریان اب جیل میں ہیں۔ نوجوان حکومت کے ساتھ سخت پالیسی کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ ایک قائد مامون البضیبی خود کہتے ہیں: ہمارے نوجوان کچھ کر گزرنا چاہتے ہیں، ایک ناامیدی کی کیفیت ہے کہ ہمارا وجود برداشت نہیں کیا جا رہا۔ ہمیں جواب دینے پڑتے ہیں۔ گرفتاریوں پر مامون البضیبی کا تبصرہ یہی تھا: 'یہ نومبر کے انتخابات کی تیاری ہے'۔

مسلم ممالک کے عاقبت نااندیش حکمرانوں اور ان کی سرپرست مغربی طاقتوں کے سامنے الجیریا کی مثال ہے لیکن یہ جمہوری اقدار کو کام کرنے کا موقع دینے کے بجائے تسلط، جبر اور آمریت کے ہتھکنڈے آزما کر قوم کو تباہ و برباد کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ فرانس کے نئے صدر شیراک انتخابات سے پہلے مداخلت کرنے، 'سکھانے' کے خلاف اور مصالحت کی حمایت میں بول رہے تھے۔ نئے وزیراعظم نے اس وقت وزیر خارجہ کی حیثیت سے الجیریا میں آزادانہ انتخابات کی حمایت کی تھی۔ ان کے انتخابات جیتنے پر الجیریا کے حکمرانوں میں سراسیمگی تھی لیکن عملاً وہی پالیسی برقرار ہے۔ اگر فرانس کی پشت پناہی نہ ہوتی تو الجیریا کے حکمران اپنے عوام کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے۔ الجیریا میں ہر ہفتے ۵۰۰ سے ایک ہزار افراد قتل کیے جا رہے ہیں۔ حال ہی میں پیرس میں تین نہایت سینیر اور معروف افراد کا ایک کتابچہ بھی شائع ہوا

ہے جس میں حکومت کو الجیریا میں اسلامی فرنٹ سے رابطہ بحال کرنے کا مشورہ دیا گیا ہے۔ ان لکھنے والوں کا اتنا مقام اور حیثیت ہے کہ اسے حکومت کی پالیسی میں تبدیلی نہیں تو کم از کم اعلیٰ سطح پر اختلاف کا مظہر قرار دیا جا رہا ہے۔ کیا مغربی دنیا میں حسنی مبارک کا کوئی خیر خواہ نہیں۔۔ اسے بھی یہ مشورہ دے کہ وہ ملک میں آزادانہ انتخابات منعقد کروا دے تاکہ عوام کی مرضی کے نمایندے اقتدار سنبھالیں، جس طرح ہر مغربی ملک میں ہوتا ہے۔

(ماخذ: فنانشل ٹائمز، ۳۱ جولائی، ۲ اگست، ۹ اگست، گارجین ۸ اگست ۹۵)

منیلا مذاکرات: مورو مسلمانوں کی جدوجہد آزادی

محمد ایوب منیر

مورو نیشنل لبریشن فرنٹ اور حکومت فلپائن کے درمیان جنرل سانتوز شہر میں ہونے والے مذاکرات بے نتیجہ ختم ہو گئے ہیں۔ حکومت فلپائن نے فرنٹ کے سربراہ نور میسواری کو دعوت دی ہے کہ وہ چار صوبوں کے گورنر بن جائیں۔ نور میسواری اپنے موقف پر قائم ہیں کہ فلپائن کے تیرہ مسلمان اکثریتی صوبوں کو خود مختاری دی جائے۔ یہ مذاکرات حکومت انڈونیشیا کے ایما پر ہوئے، جس کے نمایندے نے مذاکرات میں شرکت کی۔ امید ہے کہ ستمبر کے آخر میں مذاکرات کا ایک اور دور جاوا میں ہو گا۔

انڈونیشیا اور ملائشیا کے درمیان گھرا ہوا ایشیائی ملک فلپائن سات ہزار سے زائد جزائر پر مشتمل ہے۔ اس کی آبادی سات کروڑ ہے۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق مسلمانوں کی آبادی ۵۰ لاکھ ہے جبکہ مسلمانوں کا دعویٰ یہ ہے کہ جنوبی فلپائن کے ۱۳ صوبوں میں ان کی آبادی ۹۰ لاکھ سے زائد ہے۔

مورو مسلمان جنوبی فلپائن میں ایک آزاد اسلامی ریاست کے قیام کے لیے چار سو سال سے سرگرم عمل ہیں۔ اس کو دنیا کی طویل ترین جدوجہد میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ پندرہویں صدی کے آغاز میں یہاں مسلمانوں کی دو عظیم الشان ریاستیں تھیں جن کے نام سولو اور میگندانو تھے۔ ۱۵۲۱ء میں ان پر ہسپانیوں نے قبضہ کیا اور ۳۷۷ سال تک یہاں حکمران رہے۔ انھوں نے شمالی افریقہ کے مسلمانوں کی طرح یہاں کے مسلمانوں کو مورو نام دیا اور انھیں عیسائی بنانے کی مہم چلائی اور شمالی علاقوں سے ہزاروں کی تعداد میں عیسائی ان علاقوں میں لا کر بسائے۔ ۱۸۹۶ء میں دو کروڑ ڈالر کے عوض امریکہ نے ہسپانیہ سے فلپائن خرید لیا نیز امریکیوں نے ان مسلمان علاقوں کو جبراً فلپائن کا حصہ بنا دیا۔ فلپائن کی آزادی کے بعد حکومت نے شمالی علاقوں سے عیسائیوں کو جبری طور پر جنوب میں بسانے کا سلسلہ جاری

رکھا، مسلمانوں سے ان کی زمینیں چھین لی گئیں۔ ان کے بچوں اور جوانوں کو قتل کیا گیا اور ہزاروں کی تعداد میں مسلمانوں کو انڈونیشیا کے جزائر میں پناہ لینی پڑی۔ یہاں تک کہ وہ علاقہ جو سو فیصد مسلمانوں پر مشتمل تھا وہاں ان کا تناسب نصف رہ گیا۔ جس علاقے میں ہر سو علم کی روشنی تھی وہاں جہالت نے ڈیرے ڈال لیے۔

ظلم و تشدد کے موجودہ سلسلے کا آغاز ۱۹۴۶ میں ہوا جب کیتھولک عیسائیوں کو مسلمانوں کے علاقے میں مکمل اختیارات دے دیے گئے۔ جن لوگوں نے ہسپانیوں اور امریکیوں کی اطاعت قبول نہ کی تھی وہ فلپائنوں کی اطاعت کیسے قبول کر لیتے۔ ۱۹۶۲ میں جنوبی علاقوں سے تعلق رکھنے والے طلبہ نے مشرق وسطیٰ میں 'محاذ آزادی' کی بنیاد رکھ دی۔ اس کے چھ سال بعد 'منڈاناؤ تحریک آزادی' (MIM) نے فریڈم پارک منیلا میں نو روز تک مسلسل ایک مظاہرہ کیا اور آزادی کے حق میں تقریریں کیں۔ ۱۹۶۵ میں مارکوس ملک کا صدر بنا۔ اس کے دور حکومت میں کم و بیش ۲ لاکھ مسلمان اپنے گھر بار چھوڑنے پر مجبور ہوگئے۔ قرآن کے نسخے، باغات، کھیت، مکانات جلا ڈالے گئے۔ حکومت فلپائن خود تسلیم کرتی ہے کہ ۵۰ ہزار مسلمان فسادات کی نذر ہوگئے جبکہ مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ ہلاک ہونے والوں کی تعداد اس سے تین گنا ہے۔

یکم مئی ۱۹۶۸ کو داتو اتوگ متالان نے آزاد اسلامی مملکت کے قیام کی جدوجہد کا آغاز کیا اور مینڈاناؤ تحریک آزادی کی بنیاد رکھی۔ اس مجوزہ آزاد مملکت کا نام بنگسا مورو رکھا گیا ہے۔ اس سے قبل مصر اور دیگر عرب ممالک میں مقیم مورو طلبہ نے دنیا کو دیگر طلبہ کے ذریعے اپنی جدوجہد سے متعارف کرا دیا تھا۔ ان میں سرفہرست سلامات ہاشم ہیں جو 'مورو اسلامک لبریشن فرنٹ' (MILF) کے قائد ہیں۔ انھوں نے تحریک آزادی کا مقصد اسلامی ریاست کا قیام قرار دیا اور اسی کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ ۱۹۷۰ میں آزادی کے لیے جدوجہد کرنے والے دو گروہوں میں بٹ گئے۔ 'نور میسواری 'مورو نیشنل لبریشن فرنٹ' (MNLF) کے سربراہ بن گئے جبکہ اسلام پرست گروہ نے 'مورو اسلامک لبریشن (MILF) کی بنیاد رکھی۔ دوسرا گروہ نور میسواری کے سوشلسٹ خیالات سے اتفاق نہ رکھتا تھا۔ دونوں تنظیموں نے اپنے زیر کنٹرول علاقوں میں اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ ۱۹۸۱ سے ۱۹۹۱ کے دوران سلامات ہاشم کے پیروکاروں نے ۲۲ میں سے ۱۸ صوبوں میں ۱۳ علاقائی کمیٹیاں قائم کر لی تھیں۔ ۳۲۷ میونسپل کمیٹیوں اور ۴،۲۷۲ دیہی کمیٹیوں نے ۸۲ ہزار کلو میٹر رقبہ کنٹرول کر رکھا ہے۔ 'بقایا چار صوبوں میں مسیحی اکثریت میں ہیں۔ 'کہا جاتا ہے کہ ان علاقوں میں سلامات ہاشم کے پیروکاروں کی تعداد چودہ لاکھ سے زائد ہے۔ 'سلامات ہاشم نے 'بنگسا مورو آرمڈ فورسز' کی بنیاد رکھی ہے۔ اس کے پاس ۲ ہزار

مسلح تربیت یافتہ نوجوان موجود ہیں اور ۶۰ ہزار لوگ ایسے ہیں کہ جن کو بوقت ضرورت طلب کیا جا سکتا ہے۔ سلامت ہاشم کو اسلامی تحریکوں کی آشیرباد حاصل ہے۔ یہ لوگ، حکومت کے خلاف مسلح جنگ کر رہے ہیں اور مکمل آزادی سے کم کسی بھی تجویز یعنی داخلی خود مختاری، دفاع، خارجہ اتحاد وغیرہ کے قائل نہیں ہیں۔

نور میسواری پچھلے تیئس (۲۳) سال سے اپنے ساتھیوں سمیت مسلح جنگ میں شریک ہیں۔ عالمی پریس میں عموماً انھی کا نام آیا ہے کیونکہ وہ اسلامی نظریات کی چھاپ نہیں رکھتے۔

۱۹۷۶ میں لیبیا کی حکومت کی مداخلت سے مورو نیشنل لبریشن فرنٹ اور حکومت فلپائن کے درمیان مذاکرات ہوئے۔ ان مذاکرات کے نتیجے میں حکومت فلپائن چار صوبوں پر مشتمل ایک علاقے کو 'داخلی خود مختاری' دینے پر راضی ہوگئی۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ جس طرح فلسطین کی آزادی سلب کر کے ڈیڑھ فیصد علاقے (غزہ اور اریحا) کو پانچ سال کے لیے محدود داخلی خود مختاری کی اجازت دی گئی ہے۔ بعد ازاں ۱۳ صوبوں کو اندرونی معاملات میں داخلی خود مختاری دینے کے معاہدے پر حکومت فلپائن نے دستخط کیے لیکن اس پر عمل درآمد نہ ہوا۔ ۱۹۸۰ میں اسلامی ممالک کی تنظیم کے سیکرٹری جنرل نے منیلا کا دورہ کیا اور حکومت فلپائن پر زور دیا کہ وہ اپنے معاہدے پر عمل درآمد کرے۔ طویل مدت کے بعد چار صوبوں پر مشتمل خود مختار علاقہ (ARMM) وجود میں آیا۔ ۱۹۸۹ میں حکومت نے کوشش کی کہ جنوبی علاقوں میں ریفرنڈم کروایا جائے لیکن مسلمانوں کا اصرار تھا کہ استصواب رائے ہو۔ آزادی کے حق میں زیادہ آرا ہونے کی صورت میں حکومت جنوبی علاقوں پر اپنا دعویٰ چھوڑ دے۔ اس عرصے میں مسلح جدوجہد جاری رہی۔ ۱۹۷۰ میں نیشنل فرنٹ اور حکومت کے درمیان مذاکرات ناکام ہوگئے۔ حکومت یہ سمجھتی ہے کہ اگر تیرہ صوبوں کو آزاد کر دیا گیا تو کم و بیش ۶۰ ہزار مربع میل کا علاقہ ہاتھ سے نکل جائے گا۔ حکومت فلپائن یہ بھی جانتی ہے کہ دنیا کے مسلمانوں میں مورو جدوجہد آزادی کے بارے میں بیداری نہیں ہے اس لیے عالمی سطح پر فلپائن پر کوئی دباؤ نہ پڑے گا۔

حالیہ مذاکرات ۲۹ جولائی کو ختم ہوگئے۔ ان مذاکرات میں حکومت نے پے درپے تجاویز کے ذریعے نور میسواری کو اپنے جال میں پھانسنے کی بھرپور کوشش کی۔ اگر نور میسواری چار صوبوں کے گورنر بننے پر رضامندی ظاہر کر دیتے ہیں تو اس سے تحریک آزادی کو شدید دھچکا پہنچے گا۔ امت مسلمہ کی یہ ذمہ داری ہے کہ مورو مسلمانوں کو اپنی جدوجہد میں تنہا نہ چھوڑے اور سفارتی دباؤ اور عوامی رائے کے ذریعے انھیں ہر ممکن مدد بہم پہنچائے۔

تہذیبوں کا تصادم —— ایک جائزہ

محمد الغزالی

فوکویاما کے 'اختتام تاریخ' کے نظریہ کے بعد اب دنیا ہنٹنگٹن (HUNTINGTON) کی تہذیبوں کے تصادم کی پیش گوئی پر بحث و مباحثہ میں مصروف ہے۔ یہ بحث ' بالعموم تاریخ کی حرکیات کے بارے میں مغرب کے پیش کردہ تصورات کی حدود کے اندر ہو رہی ہے۔

ہنٹنگٹن کی یہ بات تو درست ہے کہ عالمی سیاست کے رجحان میں اضافہ اور قومی ریاستوں کے کردار میں کمی ہو رہی ہے۔ لیکن جب وہ ریاستوں کے درمیان کشمکش کے بجائے عالمی تہذیبوں کے درمیان تصادم کی پیش گوئی کرتا ہے تو دراصل وہ تنگ نظری کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس کے نزدیک انسان کے تہذیبی رشتوں کو اس کے سیاسی نظریات اور معاشی مفادات پر فوقیت حاصل ہے۔

مغرب کے علمی حلقوں میں پیش کیے جانے والے ان خیالات کا' جو ان کی صدیوں کی محدود سوچ کے آئینہ دار ہیں' ناقدانہ جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

۱۔ مغرب کے علمی رویوں پر' اس کی تہذیب کے متبادل فکر و عمل کے بارے میں سخت تعصب کی چھاپ ہے۔ اس کی جڑیں مغرب کے تاریخی تجربے میں ہیں۔ رومن ایمپائر کے قبول عیسائیت سے چرچ کو جو بالاتر کردار ملا' اس نے چرچ کے ادارے کو دنیا پرستی اور استحصال کی علامت بنا دیا۔ بالاخر چرچ کے کردار کو محدود کر دیا گیا۔ اس تاریخی عمل نے مغرب کے اہل علم کو مذہب کے بارے میں تعصب میں مبتلا کر دیا ہے۔ اب وہ ہر ایسے نظام کو مسترد کرتے ہیں جس کا محور مذہب ہو۔ وہ انسان اور کائنات کے کسی ایسے تصور کو قبول نہیں کرتے جس کا پس منظر مذہبی ہو۔ انھیں بدھ' کنفیوشس یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں کوئی افادیت نظر نہیں آتی۔ وہ مذہب کو ہم آہنگی اور توافق کے بجائے تنازع اور تفریق کا سبب گردانتے ہیں۔ جدید مغرب ان تمام ثقافتی روایات کو اجنبی سمجھتا ہے جو مذہب کو مسترد کرنے میں اس کی شریک نہیں ہیں۔

۲- ڈارون اور اس کے شاگردوں کے وقت سے مغرب میں جو خیالات رائج ہیں وہ انسان کو ایک نوع قرار دیتے ہیں جو تنازع للبقا کے نتیجہ میں وجود میں آیا ہے۔ اس کا اثر ہے کہ مغرب کا ذہن مسلسل تنازع اور کشمکش کو انسانی زندگی کا لازمی قانون سمجھتا ہے۔ پھر فرائڈ نے نفسیات کے ایسے نظریے پیش کیے جن سے انسان، اسفل جذبات کا اسیر، ایک خود غرض جانور ثابت ہوتا ہے۔ غرض مغرب کا ورلڈ ویو افراد کی اور ان کے معاشروں کی مسلسل باہمی کشمکش سے عبارت ہے۔ مشہور مورخ آرنلڈ ٹائن بی کا "چیلنج اور جواب" کا نظریہ بھی اسی کا اثر کہا جاسکتا ہے۔ مغرب کی نظر میں، نام نہاد بقائے اصلح ہی اصل الاصول ہے۔ کوئی اخلاقی قدر اس طے شدہ عمل میں مداخلت نہیں کر سکتی۔ اس لیے ہنٹنگٹن تہذیبوں کے لیے دوہرے معیارات کا جواز تسلیم کرتا ہے، لیکن اس کا اختیار قدرتی طور پر غالب تہذیب کو حاصل رہے گا۔ کمزور کا کوئی حق نہ ہوگا۔ عدل، مساوات، سب بے معنی الفاظ ہو جائیں گے۔ اگر انسانی معاملات کو عدل و انصاف سے چلایا جانا ہے تو انھیں افراد کی پسند و ناپسند سے بالا کسی اعلیٰ تر اخلاقی نظام کی مستقل اقدار پر مبنی ہونا چاہیے۔ اگر یہ منطق تسلیم کی جائے تو ڈارون کے ورلڈ ویو کی عمارت گر جاتی ہے۔

۳- مغرب کے اہل علم و دانش بالعموم مختلف تہذیبوں کے ایک دوسرے کو مالا مال کرنے کے عمل کو تسلیم نہیں کرتے۔ ہنٹنگٹن کے نتائج بھی اس کی غمازی کرتے ہیں۔ مگر یہ امر واقعہ ہے کہ دنیا کی تاریخ میں کوئی بھی تہذیب یکایک خلا سے آکر واقع نہیں ہوئی ہے۔ ہر تہذیب ماضی کے ورثہ سے اور معاصر تہذیبوں سے اخذ کرتی ہے۔ اس لیے تہذیب انسانی کا طرۂ امتیاز باہمی لین دین ہے نہ کہ تنازع و تصادم، جیسا کہ ہنٹنگٹن نے پیش کیا ہے۔

۴- گذشتہ عشروں کی سائنس کی ترقی نے انسانی مقاصد کے ناقابل تقسیم اور مشترک ہونے کی سمت میں شواہد پیش کیے ہیں۔ جس کسی کو انسانیت کی بقا عزیز ہے اسے اختلاف و افتراق کے بجائے اتحاد و اشتراک کے لیے اقدامات کرنا چاہییں۔ لیکن مغرب میں سارا زور انسانیت کے مختلف عناصر کے درمیان کشمکش اور تصادم بڑھانے پر ہے۔ یہ وقت کے تقاضے کے خلاف ہے۔

۵- مغرب قوموں کے عروج و زوال کے بارے میں غلط فہمی کا شکار ہے۔ ہنٹنگٹن کے نظریے میں بین الاقوامی تعلقات میں اخلاقی پہلو کو سرے سے کوئی مقام حاصل نہیں ہے۔ مغرب تاریخ انسانی میں انسان کے کردار کو اہمیت نہیں دیتا۔ انسانیت کے خلاف جو جرائم کیے جا رہے ہیں، جو جنگیں لڑوائی جا رہی ہیں، سی آئی اے، کے جی بی، موساد اور را بھی سازشوں میں مصروف ہیں۔ ان سب کو نظرانداز کر کے، بعض قوموں کی ناکامی کو ان کے نسلی طور پر نااہل اور بعض کی کامیابی کو ان کی نسلی برتری کا

سبب قرار دیتا ہے۔ اسی طرح فاتح اور مفتوح دونوں تاریخ کی تخلیق نظر آتے ہیں۔ اس طرح 'تاریخ کی حیثیت ایک اندھے اور بے رحم قانون کے عمل کی ہو جاتی ہے۔ انسان ذمہ دار نہیں رہتا۔ لیکن ساتھ ہی وہ تاریخ انسانی میں اپنے مثبت کردار کو تسلیم کروانے سے بھی محروم رہ جاتا ہے۔

۶۔ مغرب کے علم میں ایک اہم خامی اور بھی ہے جس کا نوٹس لینا چاہیے۔ یہ جو ہے' اس سے جو ہونا چاہیے' کا نتیجہ نکالتا ہے۔ لیکن یہ 'ہے' تحقیق کار کے اپنے رجحان اور تعصب سے متاثر ہوتا ہے۔ معروضیت کے تمام دعووں کے باوجود' تحقیق کار انھی نتائج کو پیش کرتا ہے جو اس کے نظریے کے مطابق ہوتے ہیں اور از حقائق کو نظر انداز کر دیتا ہے جو اس کے نظریے کی تائید نہیں کرتے۔ اسی لیے حقیقت مسخ ہو کر سامنے آتی ہے۔

ہنٹنگٹن کے تہذیبوں کے تصادم کے بارے میں یہ چند خیالات ہیں۔ ضرورت ہے کہ اس کا مفصل ناقدانہ جائزہ لیا جائے۔ اس سے مغرب کے اہل علم کے بعض بنیادی طور پر غلط تصورات سامنے آتے ہیں۔ (ترجمہ و تلخیص : مسلم سجاد)

رسائل و مسائل

پراویڈنٹ فنڈ اور سود

ملازمین کی تنخواہوں سے جو پراویڈنٹ فنڈ منہا کیا جاتا ہے اس پر حکومت یا کوئی آجر جو منافع' دیتا ہے' اسے سود تصور کر کے بہت سے لوگ نہیں لیتے۔ کچھ علما کا یہ موقف میرے علم میں آیا ہے کہ اس اضافی رقم کی نوعیت سود کی نہیں ہے۔ آپ کی کیا رائے ہے؟ نیز اس فنڈ سے جو قرض سود پر لیا جاتا ہے' اس کا کیا حکم ہو گا؟

ملازمین کے جبری پراویڈنٹ فنڈ پر حکومت یا کوئی دوسرا آجر اپنی طرف سے جو اضافی رقم سود کے نام سے دیتا ہے وہ سود نہیں ہے۔ "سود (ربا) قرض پر اضافے کو کہتے ہیں جبکہ بطور شرط کے لیا جائے۔ مگر ملازم کی اجرت سے کاٹی گئی پراویڈنٹ فنڈ کی رقم اس کی ملکیت اور قبضے میں ہی نہیں آتی تو قرض دینے اور اس پر زائد رقم لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگرچہ ملازم کے اکاؤنٹ میں یہ رقم لکھی جاتی ہے لیکن یہ ملکیت اور قبضہ نہیں ہے' کیونکہ اسے تصرف کا اختیار نہیں ہوتا۔ ملکی قانون کی رو سے بھی یہ ملازم کی ملکیت نہیں ہے' اسی لیے تو اس پر ٹیکس نہیں لگتا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس اضافی رقم کی حیثیت کیا ہے؟ جواب یہ ہے کہ تنخواہ سے کاٹی گئی رقم تو ملازم کی تنخواہ کا ایک حصہ ہی ہے۔ باقی رہی اضافی رقم' تو اس کی دو حیثیتیں ہو سکتی ہیں ایک یہ کہ اسے آجر کی طرف سے ملازم کی مالی اعانت تصور کیا جائے' جو ریٹائر ہونے کے وقت کی جاتی ہے۔ اس پر اعتراض ہو سکتا ہے کہ تبرع اور احسان کا وعدہ پورا کرنا اخلاقاً تو ضروری ہے مگر اسے عدالت کے ذریعے جبراً پورا نہیں کروایا جاسکتا' مگر اس اضافی رقم کو ملازم عدالت کے ذریعے قانوناً بھی وصول کر سکتا ہے۔ جواب یہ ہے کہ آجر یا حکومت جب کسی رعایت کا اعلان کر کے اس کے قواعد و ضوابط بنا لے تو یہ حق بن جاتا ہے جسے عدالت کے ذریعے قانوناً وصول کیا جاسکتا ہے۔

دوسری حیثیت اس زائد رقم کی یہ سمجھی جاسکتی ہے کہ یہ بھی تنخواہ کا حصہ ہے۔ اس لیے کہ جب

تقرری کے وقت یہ طے ہو جاتا ہے' یا ملکی قانون میں معروف و مشہور ہوتا ہے' کہ اتنی رقم اصل تنخواہ سے کاٹی جائے گی اور مخصوص تناسب سے کچھ رقم حکومت اپنی طرف سے جمع کرے گی' فریقین کو اس کا علم بھی ہے' اور وہ اس پر راضی بھی ہیں' تو یہ زائد رقم بھی ملازم کی اجرت میں شامل ہوگئی ہے۔ البتہ اس کی ادائگی ریٹائر ہونے کے وقت کی جائے گی۔ جیسے ملازمین کو اصل تنخواہ کے علاوہ کچھ دوسری مراعات حاصل ہوتی ہیں جن کو اجرت کا نام نہیں دیا جاتا لیکن حقیقت میں وہ شرائط ملازمت کے اعتبار سے اجیر کی اجرت اور معاوضہ میں شامل ہیں۔

بادی النظر میں تو اس اضافی رقم کی حیثیت اعانت کی معلوم ہوتی ہے لیکن یہ دوسری حیثیت بھی بن سکتی ہے۔ بہرحال اس کی حیثیت جو بھی ہو' ربا یہ نہیں ہے' اس لیے کہ نہ کسی نے قرض دیا ہے اور نہ کسی نے لیا ہے کہ اس پر زائد رقم کے لین دین کو سود کہا جا سکے۔ مولانا اشرف علی تھانوی اور مفتی کفایت اللہ نے بھی پراویڈنٹ فنڈ پر دی جانے والی زائد رقم کو جائز قرار دیا ہے (امداد الفتاوی' ج ۳' ص ۱۴۹۔ کفایت المفتی' ج ۸' ص ۹۲)

ایک اور سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ آج اس فنڈ کو سودی کاروبار میں لگاتا ہے لیکن اس لحاظ سے تو تمام اشیا میں بالواسطہ سود موجود ہے جس میں پوری قوم گرفتار ہے۔ اسی لیے تو ہم کہتے ہیں کہ اسلامی نظام کے قیام کی جدوجہد تیز تر کی جائے تاکہ ہم اس معصیت سے نجات پا سکیں۔

البتہ ملازم نے اپنی مرضی سے اپنا پراویڈنٹ فنڈ بیمہ کمپنی یا کسی ایسے ادارے کو منتقل کرا دیا ہو جو اس پر سودی کاروبار کرتا ہو تو اس صورت میں اضافی رقم سود ہوگی۔ اس لیے کہ ملازم نے گویا قبضہ لینے کے بعد اپنا مملوک مال سودی کاروبار کے لیے دیا ہے' جو جائز نہیں ہے۔

باقی رہا مسئلہ اختیاری پراویڈنٹ فنڈ کا جو ملازم نے اپنی مرضی سے بچت کر کے کٹوایا ہو' تو اس پر بھی اضافی رقم لینا عین ربا معلوم نہیں ہوتا' اس لیے کہ کٹوانا حقیقی قبضہ نہیں ہے' لیکن حکماً قبضہ ہے اس لیے کہ اگر نہ کٹواتا تو وصول کر سکتا تھا اس لیے اختیاری پراویڈنٹ فنڈ پر اضافہ لینا شبہ ربا ہے اور اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔

(۲) ملازم اپنے پراویڈنٹ فنڈ کے اکاؤنٹ سے جو رقم قرض کے نام پر لیتا ہے' اور اس کے ساتھ قواعد کے مطابق سود کے نام پر مزید رقم ملا کر واپس اپنے فنڈ میں جمع کرواتا ہے' تو بادی النظر میں یہ بھی سودی لین دین نہیں ہے۔ اس لیے کہ جو اضافی رقم وہ سود کے نام سے دیتا ہے وہ آجر کے اکاؤنٹ میں جمع نہیں ہوتی بلکہ ملازم کے اپنے اکاؤنٹ میں جمع ہوتی ہے' اسی طرح آجر جو رقم قرض کے نام پر اس ملازم کو دیتا ہے وہ شرعی لحاظ سے قرض نہیں ہے بلکہ ملازم کی اپنی تنخواہ سے کاٹی ہوئی

رقم کا ایک حصہ ہے جو قواعد و ضوابط کے مطابق اسے اس شرط کے ساتھ دیا گیا ہے کہ وہ اتنی رقم مزید ملا کر لی گئی رقم کو واپس اپنے پراویڈنٹ فنڈ اکاؤنٹ میں جمع کرے گا۔

اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک شخص نے کچھ رقم بچا کر اپنے پاس رکھی ہے تاکہ ضرورت کے وقت اسے استعمال کر سکے، لیکن شدید ضرورت کے وقت وہ اس رقم سے کچھ لے کر خرچ کر لیتا ہے، مگر بعد میں اس رقم کے ساتھ کچھ اور ملا کر دوبارہ جمع کر لیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تو نہ قرض ہے اور نہ سود ہے۔

ظاہر ہے کہ اپنا حق یا اس کا کچھ حصہ وصول کر کے دوبارہ آجر کو مزید ملا کر دینا سودی قرض کا لین دین نہیں ہے، بلکہ آجر اور اجیر کے درمیان ایک طے شدہ معاملہ ہے۔ یہ نہ جوا ہے، نہ سود ہے، اور نہ کوئی اور غیر شرعی معاملہ ہے۔

باقی رہی یہ بات کہ ملکی قانون میں اس کو قرض کہا جاتا ہے، اور اس پر زائد رقم کو سود، تو یہ وضعی اصطلاحات ہیں جن سے احکام تبدیل نہیں ہو سکتے۔ (گوہر رحمٰن)

حصص کی خرید و فروخت

حصص کا کاروبار دو طریقے سے ہوتا ہے۔ ایک تو یہ کہ ان کی خرید و فروخت کلیرنگ کے ذریعے ہوتی ہے جس کا اعلان اسٹاک مارکیٹ کرتی ہے۔ اس دن ادائیگی کر کے حصص کی ڈلیوری ملتی ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ کچھ حصص کا سودا کیا گیا اور کلیرنگ سے پہلے قیمت میں اضافہ ہو گیا۔ اب یہ حصص بیچ کر جو فرق ہوا، بغیر کچھ ادائیگی کیے یا شیئرز کی ڈلیوری کیے، منافع کی صورت میں حاصل کر لیا۔ یہی صورت حال حصص کی فروخت کی ہے۔ آج ہم نے کچھ فروخت کیے اور بغیر کلیرنگ مالیت کم ہو گئی تو انھیں دوبارہ خرید لیا گیا۔ جو فرق ہوا وہ منافع کی صورت میں مل گیا۔ آپ یہ بتایے کہ کیا بغیر ادائیگی اور بغیر ڈلیوری حصص کا لین دین اور جو فرق ہے اس کا لینا دینا جائز ہے؟ واضح رہے کہ اگر حصص خریدنے کے بعد ان کی قیمت کم ہو گئی تو ہم کو کلیرنگ پر ادائیگی کر کے حصص لینا پڑیں گے اور ان کی قیمت بڑھنے کا انتظار کرنا ہو گا۔ یہ بھی واضح رہے کہ بغیر کلیرنگ حصص کے کاروبار کا جو طریقہ ہے اس میں نفع اور نقصان دونوں ہوتے ہیں۔

لمیٹڈ کمپنی کے حصص (شیئرز) میں سرمایہ کاری اور نفع و نقصان میں شرکت کی بنیاد پر خریدنا جائز ہے۔ ہر شیئر ہولڈر اپنے حصے کے تناسب سے کمپنی کے نقد سرمائے اور اثاثوں کا مالک بن جاتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ کمپنی کا اصل کاروبار شرعاً حلال ہو۔ اس لیے کہ حرام کاروبار کرنا، مثلاً شراب کا کارخانہ لگانا، سود اور جوئے پر مشتمل کمپنی قائم کرنا، شخصی طور پر بھی جائز نہیں ہے، اور ان میں شریک ہونا بھی جائز

نہیں ہے۔

اگر شیئرز خریدنے والے کا مقصد کمپنی کا حصہ دار بن کر سرمایہ کاری کرنا نہ ہو بلکہ یہ ہو کہ جب شیئرز کی قیمت بڑھ جائے گی تو فروخت کر کے نفع کماؤں گا تو اصولی طور پر یہ کاروبار بھی جائز ہے کہ شیئرز کی خرید و فروخت دراصل کمپنی کے اموال اور اثاثوں میں متناسب حصوں کی خرید و فروخت ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ بیع و شراء یعنی بیچنے اور خریدنے کی شرعی شرائط کو ملحوظ رکھا گیا ہو۔ مثلاً اگر ملکیت اور قبضے میں آنے سے قبل ہی بیچ دیا ہو' یا ایسا معاملہ ہو جو قمار یعنی جوئے کی شکل اختیار کر لیتا ہے' یا کوئی اور ایسی شکل بن رہی ہو جو شرعی احکام پر پوری نہ اترتی ہو تو ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں دوسری چیزوں کی خرید و فروخت بھی ممنوع ہے اور شیئرز کی خرید و فروخت بھی ممنوع ہے۔ لیکن اگر شرعی قواعد و ضوابط کی صحیح معنوں میں پابندی کی گئی ہو تو بازار حصص میں حصص کی خرید و فروخت کا کاروبار کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

شیئرز کی خرید و فروخت کا ایک طریقہ وہ ہے جو دراصل سٹہ بازی اور جوا کھیلنا ہے۔ یہی طریقہ آج کل غالباً اسٹاک ایکسچینج میں زیادہ مروج ہے۔ اس میں فریقین کا اصل مقصد لین دین اور خرید و فروخت نہیں ہوتا' بلکہ فرق برابر کر کے نفع یا نقصان کا جوا کھیلنا ہوتا ہے۔ مثلاً یکم جنوری کو ایک شخص نے ۱۰ روپے فی شیئر کا سودا کیا مگر شیئر پر قبضہ دینے کی تاریخ یکم مارچ مقرر کر لی۔ جب یکم مارچ کی تاریخ آئی تو شیئر کی قیمت بڑھ کر ۱۲ روپے ہو گئی تو اس صورت میں فروخت کرنے والا خریدنے والے کو شیئرز دینے کے بجائے دو روپے فی شیئر ادا کر دیتا ہے یا اس تاریخ کو شیئر کی قیمت کم ہو کر آٹھ روپے ہو گئی تو اس صورت میں خریدار فروخت کرنے والے کو دو روپے فی شیئر دے دیتا ہے اور شیئر وصول نہیں کرتا۔ کاروبار کی یہ صورت سٹہ بازی ہے اور حرام ہے۔ میں نے سنا ہے کہ تاریخ مقررہ تک بہت سے سودے ہو جاتے ہیں اور آخر میں سب شیئرز کے لین دین کے بجائے آپس میں قیمتوں کا فرق برابر کر لیتے ہیں۔ آپ کے سوال کو جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں تو وہ اسی صورت کے بارے میں ہے۔

شیئرز کے کاروبار کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ فریقین کا مقصد صرف برابر کرنا اور سٹہ بازی کرنا نہ ہو بلکہ حقیقی معنوں میں شیئرز کی خرید و فروخت ہو' لیکن انتظامی مجبوریوں کی وجہ سے خریدار کا شیئرز سرٹیفکیٹ پر قبضہ دو تین ہفتوں تک موخر ہو جاتا ہے۔ تو کیا بیع و شراء ہو جانے کے بعد' مگر شیئرز وصول کرنے سے پہلے' ان کو آگے کسی اور کو فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر کمپنی کا قاعدہ یہ ہو کہ شیئرز کا سودا مکمل ہو جانے کے بعد شیئرز کے تمام حقوق اور ذمہ داریاں خریدار کی طرف منتقل ہو جاتی ہیں۔ اگرچہ اس نے شیئرز سرٹیفکیٹس ابھی وصول نہ کیے ہوں' تو یہ بیع جائز ہے۔ اس لیے

کہ حقوق اور ذمہ داریوں کا منتقل ہو جانا اگرچہ محسوس قبضہ نہیں ہے مگر حکماً یہ قبضہ متصور ہوتا ہے اس لیے شرعاً یہ بھی قبضہ شمار ہوتا ہے۔ لہٰذا خریدار نے جب آگے فروخت کیا تو یہ قبضہ لینے سے پہلے فروخت کرنا نہیں ہے، جو ممنوع ہے، بلکہ قبضہ لینے کے بعد فروخت کرنا ہے جو جائز ہے۔ لیکن اگر کمپنی کا قاعدہ یہ ہو کہ جب تک شیئرز کے سرٹیفکیٹس خریدار نے وصول نہ کیے ہوں اس وقت تک وہ کمپنی کا حصہ دار نہیں بن سکتا اور حقوق اور ذمہ داریاں اس کی طرف منتقل نہیں ہو سکتیں، تو پھر یہ بیع قبل القبض ہے، جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرما دیا ہے۔ مجھے معلوم نہیں ہے کہ کمپنیوں اور اسٹاک ایکسچینج والوں کا قاعدہ قانون اس بارے میں کیا ہے؟ آپ چونکہ اس کاروبار کا تجربہ اور معلومات رکھتے ہیں اس لیے مذکورہ دو صورتوں میں سے جو صورت حال ہو اس کے مطابق اپنے کاروبار کا فیصلہ خود کرلیں۔ (گ-ر)

مضطر کے لیے سودی قرض

۱۔ ہمارے گھریلو حالات معاشی دباؤ کی وجہ سے درہم برہم ہو چکے ہیں۔ ہم قرضوں کے بوجھ تلے دب گئے ہیں۔ ایک صورت یہ ہے کہ ہم ٹریکٹر حاصل کرلیں لیکن یہ سودی اسکیم کے بغیر ممکن نہیں۔ کیا اسلام میں اس کے لیے کوئی گنجایش ہے؟ ہم جانتے ہیں کہ سود حرام ہے لیکن سفید پوش پر مفلسی آئے تو کتے کا گوشت بھی حلال ہو جاتا ہے۔ ہمارے بھی یہی حالات بن چکے ہیں۔
۲۔ گذشتہ ۶ سال سے بے روزگار ہوں۔ گھریلو حالات اتنے خراب ہیں کہ بیان نہیں کر سکتا۔ دو وقت کی روٹی بھی بمشکل میسر ہے۔ کچھ کاروبار کا ارادہ کیا لیکن اس کے لیے پیسوں کی ضرورت تھی۔ ہر جائز اور متوقع مقام سے کوشش کی لیکن مایوسی ملی۔ ایک دوست کے ذریعے بنک سے ملنے کی توقع ہے۔ جانتا ہوں کہ سود خدا اور رسولؐ سے کھلا اعلان جنگ ہے۔ کیا کروں نہیں لیتا تو حالات اتنے خراب ہیں کہ خودکشی کرنے کو جی چاہتا ہے۔

سود کی حرمت بڑی شدید ہے، اور آپ اس سے واقف ہیں۔ سود کا لینا بھی حرام ہے اور دینا بھی۔ اس لیے اس سے اجتناب کی ہر ممکن کوشش آپ پر فرض ہے۔ اپنے اخراجات کم کریں، متبادل ذرائع آمدنی تلاش کریں، اور جو کچھ کر سکتے ہوں وہ کریں۔ تمام کوششوں کے باوجود فقر و فاقہ کا سامنا ہو، عزت پر بن رہی ہو، تو پھر کیا کریں؟

سود کا دینا اسی طرح حرام ہے جس طرح لینا، لیکن دینا اسی لیے حرام ہے کہ لینا حرام ہے۔ اگر آدمی اتنا ضرورت مند ہو کہ مضطر کی تعریف میں آتا ہو تو سور کا گوشت کھانے کی بھی اجازت ہے۔ اور اس پر کوئی مواخذہ نہیں۔ اس لیے سود دینے کے سلسلے میں علما کرام کا مسلک یہ ہے کہ "سود کو ادا

کرنے کی حرمت بذات خود نہیں بلکہ اس وجہ سے ہے کہ یہ سود خواری کا ذریعہ ہے۔ اس لیے بعض خاص حالات میں 'عذر کی بنیاد پر' سود اداکر کے قرض لینے کی اجازت دی جا سکتی ہے۔ کون سا عذر معتبر ہے اور کون سا نہیں' اور کون سی حاجت قابل لحاظ ہے اور کون سی حاجت قابل لحاظ نہیں۔ اس سلسلے میں معتمد اصحاب افتا کے مشورے پر عمل کیا جائے۔ (اسلامک فقہ اکیڈمی (تمام مکاتب فکر کا) دوسرا فقہی سیمی نار' ۹ تا ۱۱ دسمبر ۱۹۸۵' دہلی)

مثلاً' جان و مال کی حفاظت اور حکمران کو عدل پر آمادہ کرنے کے لیے رشوت دینے کی اجازت دی گئی ہے۔ "الرشو قلخوف علی ماله او نفسه او یبری امر ه عنه عند سلطان او امیر (الاشباہ و النظائر للسیوطی)۔ اسی طرح حاجت مندوں کے لیے سود دینے کی گنجائش دی گئی ہے۔ یجوز للمحتاج الاستقراض بالربح (الاشباہ و النظائر لابن نجیم)۔ اگر آپ یہ جانتے ہیں کہ سود کے معاملے میں دین کے احکام کیا ہیں' اگر آپ کے سامنے آخرت کا عذاب ہے' اگر آپ کو یہ معلوم ہے کہ مفتی آپ کو کوئی بھی فتویٰ دے' بالآخر آپ کو اللہ کے سامنے اپنا عذر پیش کرنا ہو گا' تو پھر میری رائے یہ ہے کہ آپ اپنے دل سے فتویٰ پوچھیں۔ فقر و فاقہ کو کفر کے برابر کہا گیا ہے۔ اگر آپ کو ظن غالب ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کا عذر قبول کرے گا' تو آپ اپنی معاشی مشکل سے نجات پانے کے لیے سود پر قرض لے سکتے ہیں۔ لیکن اس کو مال حلال سمجھ کر استعمال نہ کریں' بکراہیت یہ کام کریں' صرف بقدر ضرورت لیں' مسلسل نجات کی سعی کرتے رہیں' اور اللہ تعالیٰ سے استغفار بھی کرتے رہیں۔

مولانا عروج احمد قادری سابق مدیر زندگی لکھتے ہیں: "مجبوری میں سود دینے کی رخصت ہے' سود لینے کی رخصت کسی حالت میں نہیں ہے۔ اگر مسلمان مجبور ہو جائے' تو سودی قرض لے سکتا ہے' لیکن مسلمان کو یہ فیصلہ آخرت کے عذاب کو سامنے رکھ کر کرنا چاہیے کہ وہ سودی قرض لینے کے لیے واقعی مجبور ہے یا نہیں"۔ (عشر و زکوٰۃ اور سود کے چند مسائل' ص ۱۲۵)۔

مفتی نظام الدین صاحب' صدر مفتی دارالعلوم دیوبند لکھتے ہیں: جب کہ بغیر قرض لیے کام نہ چلے' اور غیر سودی قرض نہ ملے' اور بغیر اس قرض کو لیے ناقابل تحمل و برداشت تکلیف کا سامنا ہو' معیشت باقی نہ رہے یا کاروبار معطل ہو جائے' تو بوجہ مجبوری اور بقدر مجبوری' سودی قرض لینے کی گنجائش ہوگی جیسا کہ الاشباہ و النظائر کے اس جزئیہ یجوز للمحتاج الاستقراض بالربح' سے اور اس کی شرح حموی سے معلوم ہوتا ہے۔ البتہ ایسا قرض جہاں تک ہو سکے جلد سے جلد ادا کر کے سبک دوش ہو جانا لازم رہے گا۔ اسی طرح جہاں تک ہو سکے اس سے بچنا بھی چاہیے۔ (مجلہ فقہ اسلامی' دہلی)

خرم مراد

کتاب نما

فی ظلال القرآن سید قطب شہید' مترجم سید حامد علی- ناشر: البدر پبلی کیشنز' اردو بازار لاہور' جلد اول (الفاتحہ' البقرہ)- صفحات ۸۰۶' قیمت ۵۷۱اروپے- جلد دوم (آل عمران) صفحات: ۵۰۲- قیمت: ۰۱۳اروپے- جلد سوم (النساء) صفحات: ۶۹۱- قیمت ۰۰۲اروپے

سید قطب شہید دور حاضر کے جلیل القدر اسلامی مفکر' مجاہد اور نابغہ تھے۔ عالم' مفسر' ادیب' شاعر' نقاد' صحافی- اللہ تعالیٰ نے انھیں غیر معمولی صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ انھوں نے علم و ادب کے ہر شعبے میں اپنی دانش و بینش اور ذہانت و قابلیت کے نقوش ثبت کیے- یوں تو ان کی دو درجن تصانیف میں سے بھی اپنے اپنے موضوعات پر نمایاں اور قابل لحاظ حیثیت رکھتی ہیں لیکن "فی ظلال القرآن" ان کی بالغ نظری' پختہ فکری' دانشوری اور علمی فضیلت کا شاندار نمونہ ہے۔

قرآن حکیم کی تفسیر لکھنا بہت بڑی سعادت ہے- سید قطب تو اس سعادت سے بہرہ مند ہونے کے بعد' شہادت کے مقام پر بھی فائز ہوئے ؎ یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں؟ "فی ظلال القرآن" ایک ہمہ جہتی تفسیر ہے (علمی و فکری' تحریکی و انقلابی' ترجیحی و دعوتی) بقول سید حامد علی "مصنف کی فکری زندگی کے سب سے زیادہ کارکردگی کے سالوں کا ثمرہ"- زیر نظر تفسیر کی اہمیت کا اندازہ' فاضل مترجم کے اس قول سے لگایا جاسکتا ہے کہ "اس تفسیر سے میرے علم میں' میرے فہم قرآن میں' میرے ایمانی جذبات میں اور اللہ اور اس کے دین سے میرے لگاؤ میں اضافہ ہوا ہے"۔ (ص ۳۰)

مولانا سید حامد علی کا شمار بھارت کی تحریک اسلامی سے وابستہ ممتاز اہل قلم میں ہوتا ہے- وہ کئی برس تک ماہنامہ "زندگی" رام پور کے مدیر رہے- ان کی چھوٹی بڑی تصانیف کی تعداد تقریباً ایک سو ہے۔

"فی ظلال القرآن" کا ترجمہ کسر نفسی کے سبب' انھوں نے بڑے تامل سے ہاتھ میں لیا تھا' لیکن پھر انھوں نے اس کام کو پوری توجہ اور احساس ذمہ داری اور ایک گہرے والہانہ قلبی جذبے کے ساتھ

انجام دیا۔ (افسوس ہے کہ ۳ مارچ ۱۹۹۲ کو ان کا انتقال ہو گیا اور یہ کام ادھورا رہ گیا)۔ بہرحال اس کی چار جلدیں پہلے بھارت میں اور اب پاکستان میں چھپی ہیں اور مترجم کے تحقیقی مزاج' وسعت مطالعہ اور محنت و کاوش کی آئینہ دار ہیں۔ اردو میں "فی ظلال القرآن" کے ایک سے زائد ترجمے ہوئے ہیں۔ زیر نظر ترجمے میں بعض ایسی خوبیاں نظر آتی ہیں' جو دوسرے تراجم میں موجود نہیں' مثلاً:

(۱) قرآن حکیم کے بیسیوں اردو ترجمے ہو چکے ہیں۔ سید حامد علی صاحب کے لیے ایک آسان صورت تو یہ تھی کہ وہ کوئی ایک ترجمہ اختیار کر لیتے' مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا کیونکہ ان ترجموں میں لفظی اختلافات کے ساتھ ساتھ' ان کے بقول: ''خاصے معنوی اختلافات'' بھی موجود ہیں۔ چنانچہ انھوں نے (اس احساس کے ساتھ کہ: ''قرآن مجید کا ترجمہ کرنا' دنیا کا سب سے عظیم' سب سے دشوار اور سب سے نازک کام ہے'' اپنی ''کم مائیگی اور بے بضاعتی'' کا اعتراف کیا ہے۔ بایں ہمہ اپنے تئیں ایک راہ نما' نسبتاً بہتر اور اطمینان بخش ترجمہ کرنے کی سعی کی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ پاورقی حاشیے میں بعض اہم مترجمین قرآن (شاہ عبدالقادر' مولانا محمود حسن' ڈپٹی نذیر احمد' مولانا اشرف علی تھانوی' مولانا فتح محمد جالندھری' مولانا مودودی اور مولانا امین احسن اصلاحی) کے ترجمے بھی دے دیے ہیں۔

(۲) سید قطب کے ہاں عموماً قرآنی آیات کا حوالہ نہیں دیا گیا۔ مترجم نے تفسیر میں مذکور جملہ آیات کے ساتھ حوالوں (اور ان کے تراجم) کا اہتمام کیا ہے۔ احادیث بالعموم بلاحوالہ ہیں۔ سید حامد علی نے کتب احادیث کے حوالوں کے ساتھ ساتھ' بعض احادیث کے لفظی یا معنوی اختلافات کی وضاحت کی ہے اور بتایا ہے کہ صحت کے لحاظ سے حدیث کا کیا مقام ہے----

(۳) سید حامد علی کے ہاں ایک اور خوبی یہ نظر آتی ہے کہ انھوں نے بعض واقعات اور مسائل کے ضمن میں 'اپنی طرف سے بھی کچھ مزید توضیحات کر دی ہیں۔ مصنف سے کہیں اختلاف محسوس ہوا' تو حاشیے میں اس کی نشان دہی کی ہے۔ کسی آیت یا سورت سے متعلق کچھ امور یا دوسرے مفسرین کے نقطہ ہائے نظر قابل ذکر محسوس ہوئے تو اختصار کے ساتھ انھیں بھی حاشیے میں بیان کر دیا اس ضمن میں مترجم نے بعض مقامات پر مولانا حمید الدین فراہی' مولانا امین احسن اصلاحی یا مولانا مودودی کی تفسیری آرا نقل کی ہیں۔

(۴) ابتدا میں سید قطب کے تعارف اور "فی ظلال القرآن" کی اہمیت اور خصوصیات پر مشتمل ان کا سیر حاصل مقدمہ بھی خاصے کی چیز ہے۔ اس حصے میں انھوں نے اپنے ترجمے کی پوری سکیم کی نوعیت اور پس منظر پر روشنی ڈالی ہے۔

درحقیقت سید حامد علی مرحوم کی یہ تحقیقی کاوش اردو کے تفسیری ذخیرے میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ: "مترجم کے علم و یقین کی رو سے تفسیر "فی ظلال القرآن" اپنی نوعیت کی ایک ہی تفسیر ہے۔ اس طرح کی کوئی تفسیر اردو تو کجا' عربی میں بھی موجود نہیں"۔ (ص ۔ ۳) ہمارا خیال ہے کہ زیر نظر اردو ترجمے میں سید حامد علی مرحوم نے اپنی جو تحقیقی کاوشیں شامل کیں ("میں نے اپنی تمام ذہنی و فکری توانائیوں کو اس کام میں جھونک دیا") (ص ۔ ۵)۔ اس سے یہ اردو ترجمہ' اصل عربی تفسیر سے کہیں زیادہ جامع اور مفید تر ہو گیا ہے۔ بلاشبہ اردو کے تفسیری ادب میں یہ ایک نادر اور قیمتی اضافہ ہے۔ (ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی)

چیچنیا کے سرفروش ' محمد الیاس انصاری۔ ناشر: کہکشاں پبلشرز لاہور۔ صفحات: ۹۶۔ قیمت: ۴۰ روپے۔

اگرچہ نبی کریم ؐ کے اس فرمان کی صداقت ہمیشہ سے روز روشن کی طرح عیاں رہی ہے کہ الکفر ملة واحدة' لیکن بیسویں صدی کی رواں دہائی میں عالمی تناظر میں مسلم دنیا جس تکلیف دہ صورت حال سے دوچار ہے' اس کی روشنی میں مذکورہ بالا فرمان کی صحت و صداقت' روز بروز نکھرتی چلی جارہی ہے۔ مسئلہ کشمیر کا ہو' افغانستان کا یا اراکان' فلسطین' بوسنیا یا چیچنیا کا بڑی عالمی طاقتیں اور دنیا کے بڑے بڑے متحارب گروہ اپنے اختلافات کو بھلا کر مسلم امہ کے خلاف صف بستہ ہو جاتے ہیں اور اس صف بستگی میں انھیں عالمی امن' بقائے باہمی اور انسانی حقوق وغیرہ کے تمام نعرے بھول جاتے ہیں۔ چیچنیا کا مسئلہ' عالم اقوام کے لیے ایک سلگتا ہوا سوال ہے مگر یہاں روس کی جارحیت کو امریکہ کی مجرمانہ پشت پناہی حاصل ہے' جس طرح عراق پر امریکی جارحیت نے روس کو مجرمانہ طور پر مہر بہ لب رکھا تھا۔

چیچنیا کے مسلمانوں نے اپنی آزادی کے خلاف روس کی شرمناک جارحیت کا جس شجاعت اور بے جگری سے مقابلہ کیا ہے وہ خود روس اور مغرب میں اس کے خاموش حواریوں کے لیے حیران کن ہے۔ پونے دو سال ہو چلے ہیں (چیچنیا پر روس کے باقاعدہ حملے کا آغاز ۱۱ دسمبر ۱۹۹۴ کو ہوا تھا) مگر ۱۲' ۱۴ لاکھ کی آبادی والا یہ چھوٹا سا ملک روسی عفریت کے قابو میں نہیں آسکا۔ اب بھی مزاحمت کسی نہ کسی سطح پر جاری ہے۔ اس مزاحمت کے رشتے ماضی میں بہت دور تک جاتے ہیں۔ روسی' تاتار اور قفقازی مسلمانوں کا وجود ختم کرنے کے لیے قدیم زمانے سے کوشاں رہے ہیں۔ امام منصور اور امام شامل کی تحریک جہاد نے روسیوں کو ناکوں چنے چبوا دیے۔ سٹالن نے ۱۹۴۴ میں دس لاکھ مسلمانوں کو

جبراً جلاوطن کر دیا۔ لیکن ''مسلمان اور ان کی روح جہاد کا علاج کس کے پاس ہے''۔ (دیباچہ از خرم مراد، ص ۱۵)

محمد الیاس انصاری نے بڑی محنت اور کاوش سے شیشان کے ماضی اور حال کا منظرنامہ پیش کیا ہے۔ اہل شیشان کے خلاف روس کی سازشیں، غداروں کی پشت پناہی، اقتصادی ناکہ بندی، جھوٹا پراپیگنڈا، پھر براہ راست فوج کشی، انسانی حقوق اور اخلاقی اصولوں کی پامالی، دوسری طرف مجاہدین کی جہادی سرگرمیاں اور مزاحمتی حکمت عملی، اسی طرح مغربی طاقتوں کے مگرمچھ کے آنسو اور دیگر متعلقہ اور ضروری تفصیل۔ مصنف کا خیال ہے کہ اگر روس چیچنیا پر مکمل قبضہ کر بھی لے تو اسے برقرار رکھنا نہایت مشکل ہو گا کیونکہ روح جہاد کو سلب کرنا کسی کے لیے ممکن نہیں۔

اس مسئلے کا ایک نہایت تکلیف دہ پہلو یہ ہے کہ چیچنیا پر روسی حملے اور جارحیت کو ماسکو میں پاکستانی سفیر نے روس کا ''اندرونی معاملہ'' قرار دیا ہے۔ دیگر اسلامی ممالک نے بھی مایوس کن رویہ اختیار کیا۔ ایسا نہ ہوتا تو اہل کفر کے ہاتھوں کشمیر، بوسنیا، اور چیچن کے عوام گاجر مولی کی طرح کیوں کٹ رہے ہوتے۔ بہرحال اپنے موضوع پر اردو میں یہ پہلی کتاب ہے، مختصر مگر جامع۔ تجزیاتی پہلو پر قدرے زیادہ توجہ دی جاتی تو بہتر تھا (د-ع)

قومی تعلیمی پالیسی، ۱۹۹۲ تا ۲۰۰۲، ایک جائزہ۔ مرتب: سلیم منصور خالد۔ ناشر: انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، مرکز ایف سیون، اسلام آباد۔ صفحات: ۲۲۲۔ قیمت: ۱۵۰ روپے۔

پاکستان میں اول روز سے قومی سطح پر مسئلہ تعلیم سے جس بے نیازی اور اغماض کی پالیسی پر عمل کیا جا رہا ہے وہ ہماری زبوں حالی کی ایک بہت بڑی وجہ ہے اگرچہ اس میں ہمارے ارباب اقتدار کی ''غیر ذمہ دارانہ روش'' کو اس صورت حال میں بنیادی دخل ہے تاہم اس اجتماعی کوتاہی اور ملی گناہ میں معاشرے کے بہت سے دوسرے طبقے بھی کسی نہ کسی درجے میں شریک ہیں (اقبال کے بقول فطرت کبھی کرتی نہیں، ملت کے گناہوں کو معاف ــــــ!

زیر نظر کتاب میں قومی تعلیمی پالیسی (۱۹۹۲ تا ۲۰۰۲) کا نہایت تفصیل اور گہرائی کے ساتھ جائزہ لیا گیا ہے۔ خامیوں اور کمزوریوں کی نشاندہی کے ساتھ اصلاح احوال کے لیے تجاویز بھی دی گئی ہیں۔ انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز اس کاوش کے لیے مبارک باد کا مستحق ہے کہ اس نے ماہرین تعلیم اور دانش وروں کو جمع کرنے کا اہتمام کیا (تعلیمی مذاکرہ، ۱۰-۱۱ اپریل ۱۹۹۳)۔ ان کی ساری گفتگو اور مقالات کو کتابی شکل میں مرتب کر دیا۔ کتاب کے مطالعے سے مندرجہ ذیل نکات نمایاں طور پر سامنے

آتے ہیں۔

(۱) سرکاری سطح پر تعلیم عملاً ہماری ترجیحات میں شامل ہی نہیں۔ (۲) تعلیم کے شعبے کے لیے انتہائی قلیل اور ناکافی رقم فراہم کی جاتی ہے۔ (۳) ملک میں بیک وقت کئی قسم کے نظام ہائے تعلیم چل رہے ہیں، جس سے ملک میں معاشی، سیاسی اور معاشرتی طبقاتی تفاوت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ (۴) ذریعہ تعلیم کی اہمیت کو مسلسل نظر انداز کرتے ہوئے ہر قیمت پر انگریزی زبان کو مسلط کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ (۵) فروغ تعلیم کے لیے منصوبہ بندی کا فقدان ہے۔ (۶) نصاب تعلیم اور امتحانی صورت حال کو بہتر بنانے کے لیے کوئی توجہ نہیں دی جارہی۔ نتیجتاً تعلیم کا معیار دن بدن گر رہا ہے۔ (۷) سائنسی مضامین کی تدریس کے لیے مطلوبہ تعلیمی قابلیت کے حامل اساتذہ موجود نہیں ہیں اور سائنس پڑھنے والے طلبہ کی تعداد سال بہ سال کم ہو رہی ہے۔

کتاب میں تعلیم سے متعلق تمام اہم امور سے بحث کی گئی ہے۔ مگر ایک کمی یہ محسوس ہوئی کہ تعلیم و تدریس کی کامیابی کے سلسلے میں والدین کے کردار کو زیر بحث نہیں لایا گیا۔ تعلیم اور اس کے گوناگوں مسائل سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ کتاب ایک قیمتی اور نہایت سودمند دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ (پروفیسر رؤف احمد شاہ)

مضامین غلام ربانی　غلام ربانی۔ ناشر: انجمن ترقی اردو، پاکستان، ۱۵۹ ڈی، بلاک ۷، گلشن اقبال، کراچی۔ صفحات ۲۴۴۔ قیمت ۱۰۰ روپے۔

مختلف موضوعات پر ۲۶ دلچسپ مضامین کا یہ مجموعہ ایک ایسے بزرگ اہل قلم کی یادگار ہے، جنھیں مدت دراز تک محمد علی جوہر اور بابائے اردو مولوی عبدالحق ایسے اکابر کی رفاقت میں کام کرنے کا موقع ملا۔ مولوی غلام ربانی کی نثرنگاری کا آغاز ۱۹۰۸ء میں ”پیسہ اخبار“ سے ہوا۔ پھر ان کی تحریریں ”کامریڈ“، ”ہمدرد“، ”تمدن“، ”ہمایوں“، ”اردو“، ”نورس“ اور ”جامعہ“ وغیرہ میں شائع ہوتی رہیں۔ وہ انجمن ترقی اردو کے مختلف علمی کاموں میں مولوی عبدالحق کے علمی معاون رہے۔ اور انھوں نے انجمن کے لیے متعدد کتابیں تصنیف و تالیف کیں۔

زیر نظر مضامین میں بڑا تنوع ہے۔ چند عنوانات: سرسید اور علم الآثار، سکے، تاریخ اور شاعری، محراب، مینار، لال قلعہ، فن اور زندگی، کائنات کا مذہبی تصور، اردو ہندی ڈکشنری، اورنگ آباد، الف لیلہ کا بغداد، اجنتا کی نقاشی کی کہانی، دلی کے مقبرے، مرزا فرحت اللہ بیگ کا مزاج وغیرہ۔

مضامین بظاہر بیانیہ اور تاثراتی ہیں، مگر ان سے مصنف کے نکتہ رس ذہن، دانش ورانہ سوچ،

گہری نظر اور تحقیقی مزاج کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان مضامین کی ایک بہت بڑی خوبی ان کا اختصار و اجمال ہے۔ کتاب کے مقدمہ نگار جمیل الدین عالی نے بالکل بجا کہا ہے کہ "زیر نظر مقالے ' اپنے متنوع موضوعات ' سادہ اندازبیان اور ان معلومات کے لحاظ سے ' جو آج نایاب ہیں ' بڑی حیثیت رکھتے ہیں"۔ (ر - ہ)

عالم اسلام اور عیسائیت (ماہنامہ): مدیر: سفیر اختر۔ ناشر: انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز ' بلاک ۱۹ ' مرکز ایف / سیون ' اسلام آباد۔ صفحات: ۳۲۔ قیمت فی شمارہ: ۱۰ روپے۔ سالانہ: ۱۰۰ روپے۔ بیرون ملک: ۲۵ ڈالر

دور حاضر میں ' عیسائیت کی حیثیت عام مذہب کی نہیں ہے۔ یہ ان لوگوں کا مذہب ہے جو صدیوں تک بیشتر ایشیائی اور افریقی ممالک کے حکمران رہے۔ اگرچہ بیشتر غلام ممالک ' مغربی سامراج کے تسلط سے آزاد ہو چکے ہیں تاہم ذہنا" بیشتر ممالک ابھی تک انھی کی تہذیب و ثقافت اور افکار و تعلیم کے اسیر ہیں۔ مزید برآں اقوام مغرب بھی (خصوصاً ان کا امام امریکہ) مشرقی اور مسلم اقوام کو بدستور اپنے سیاسی ' تمدنی اور اقتصادی غلبے کے حصار میں مقید رکھنے کے لیے کوشاں ہیں---- اس پس منظر میں عیسائیت کا مطالعہ کئی پہلوؤں سے ہمارے لیے ضروری ہو جاتا ہے۔

زیر نظر مختصر اور معلومات افزا ماہنامے میں پیش کردہ مطالعہ عیسائیت کو دو دائروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ' اول: مسیحیت اور اس کے متعلقات پر علمائے برعظیم اور مسیحی اور مستشرقین کی تحریری کاوشیں۔ (اس میں عیسائیت سے متعلق کتابوں کا تعارف اور جائزہ بھی شامل ہے)

دوم: دنیا کے مختلف ممالک میں فروغ عیسائیت کے لیے مسیحی مبلغین کی حکمت عملی اور مشنریوں کی سرگرمیوں کی خبریں ' جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ بعض ممالک میں اسلام اور مسیحیت کی کشمکش کئی سطحوں پر جاری ہے۔ ایک مضمون میں بتایا گیا ہے کہ ۷۲ ہزار غیر ملکی مسلمان طلبہ امریکی یونی ورسٹیوں میں زیر تعلیم ہیں۔ چنانچہ انھیں مسیحیت کی دعوت دینے کے لیے مشنریوں کو دور دراز کے سفر کی ضرورت نہیں۔

اردو قارئین کے لیے یہ سب کچھ معلومات افزا ہے ' سبق آموز اور عبرت خیز۔ یہ سب کچھ ہمیں مغرب کو سمجھنے کا موقع بھی فراہم کرتا ہے۔ رسالہ محنت اور سلیقے سے مرتب کیا جاتا ہے اور اس کے اداریوں سے اس کا معتدل اور متوازن نقطہ نظر نمایاں ہے۔ رسالے کا مقصد مسلمانوں اور مسیحیوں کے درمیان افہام و تفہیم کی فضا پیدا کرنا ہے۔ وہ توقع کرتا ہے کہ اختلافات کو دور کرنے اور مسائل کو

سلجھانے کا کام "مسلمان علما اور مسیحی بالغ نظر رہنما بہ آسانی انجام دے سکتے ہیں"۔ انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز کی یہ کاوش 'بہرطور قابل داد و تحسین ہے۔ (د-۰)

سقراط : ڈاکٹر منصور الحمید' ناشر: دارالتذکیر' رحمٰن مارکیٹ' اردو بازار' لاہور۔ صفحات: ۲۹۱۔ قیمت: ۱۲۰ روپے۔

اس کتاب کی حیثیت سقراط کی فکر 'تعلیمات' اور اس کے دعوتی اسلوب پر ایک عمدہ دستاویز کی ہے۔ مصنف نے بڑی محنت' مہارت اور عمدگی سے سقراط کی حیات و فکر پر روشنی ڈالی ہے۔ سزائے موت دینے والی عدالت کے سامنے سقراط کے مشہور آخری بیان "معذرت" (Apology) کا سلیس اور رواں ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ تو اس کتاب کا ایک پہلو ہے۔ اس کتاب کا اصل محرک تو مصنف کا یہ وجدان ہے کہ سقراط نہ صرف ایک نبی تھا (ص ۴'۹) بلکہ ایک جلیل القدر پیغمبر (ص ۲۶۴) انھوں نے اپنی ساری بحث اسی مفروضے کے تحت آگے بڑھائی ہے۔ آخری باب میں تو سقراط پر وحی و الہام کی کیفیات تک کو دریافت کر لیا ہے (ص ۲۶۷-۲۷۲) اس طرح کتاب میں "مرشد" (سقراط) کی عظمت کے سامنے "مرید" (مصنف) کی خود سپردگی کی جھلک جابجا دکھائی دیتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ قرآن سے ثابت شدہ انبیاء و رسل کے علاوہ دیگر تاریخی شخصیات (مثلاً: کرشن جی' مہاتما بدھ' سقراط' کنفیوشس' زرتشت وغیرہ) کو انبیا کی صف میں لاکھڑا کرنے کے لیے ذہنی اور قلمی زور آزمائی کہاں تک سودمند ہو سکتی ہے؟ ہمارے پاس ان شخصیتوں کی قرار واقعی حیثیت کے تعین اور ان کے افکار و تعلیمات کی تصدیق کا کوئی مستند ذریعہ موجود نہیں تو پھر کیا مناسب حد تک ان کی عظمت و دانش کا اعتراف کافی نہ ہو گا؟ (ان کی تعلیمات سے اخذ و اکتساب کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں) ہمارے خیال میں انھیں انبیا کی صف میں کھڑا کرنے کے لیے زور لگانا ضروری نہیں اور نہ یہ کھینچا تانی سودمند ہے کہ ان کے افکار قرآن و حدیث کا چربہ ہیں۔

مصنف کے نزدیک سقراط روایتی مذہب کے بتوں پر کلہاڑا چلانے والا پہلا شخص ہے (ص ۲۹)' اس نے اہل یونان کے تمام دیوتاؤں کی نفی کرتے ہوئے 'صرف ایک دیوتا" اپالو" کی صداقت و ہستی کا اعتراف کیا تھا ("اپالو"' اللہ کا یونانی نام ہے)۔ سقراط کی فکر و دانش کے موتی کتاب میں جگہ جگہ نظر آتے ہیں' مثلاً: "یہ اللہ ہی ہے' جو اصل دانا اور عقلمند ہے" (ص ۱۲۰) اللہ کی اور اپنے سے بہتر لوگوں کی نافرمانی کرنا' بدی اور بے حیائی کی بات ہے (ص ۱۳۰)۔ لذتوں اور خواہشوں کو یوں اپنے اوپر سوار نہیں کر لینا چاہیے کہ یہ انسان کی مالک بن بیٹھیں (ص ۱۰۱)۔ بدن کی حفاظت سے کہیں بڑھ

کہ روح کی حفاظت کرنی چاہیے۔(ص ۶۹)۔کسی سے ادھار لینے کے بجائے اپنے آپ سے فاقہ کشی کا ادھار لے کر گزارا کرو (ص ۱۰۰)۔حکومت چلانے کے اہل صرف وہ لوگ ہیں جن میں علم اور قابلیت ہو، وہ علم اور قابلیت جس سے جمہوریت کی اسمبلی ہمیشہ خالی رہتی ہے (ص ۸۶)۔

کتاب اپنے سادہ اسلوب اور عام فہم انداز کے باعث اس عظیم فلسفی تک پہنچنے میں مدد دیتی ہے۔فلسفے کی تفہیم کے لیے اردو میں اتنی عام فہم کتب اکا دکا ہی ہیں۔تصاویر اور اشاریے نے کتاب کو اور زیادہ بامعنی بنا دیا ہے۔اس علمی خدمت کے لیے مصنف مبارک باد کے مستحق ہیں۔ — سلیم منصور خالد

نظم البیان بلطائف القرآن مولانا ابوالمعالی محمد علی فیضی ۔ ناشر ادارۃ البحوث الاسلامیہ جامعہ سلفیہ بنارس ۔ صفحات ۲۳۲ ۔ قیمت درج نہیں۔

اللہ کی آخری کتاب ہدایت قرآن مجید اپنی عجیب و غریب خصوصیت کے اعتبار سے بے مثل و بے نظیر ہے۔مسلمان علما و فضلا نے اس کی تفسیر و توضیح، قرآنی علوم و فنون کی تدوین، اس کی سور و آیات اور اس کے الفاظ و حروف کے بارے میں جو متنوع کاوشیں کی ہیں، تاریخ انسانی میں ان کی مثال نہیں ملتی۔اس کتاب ہدایت سے استفادہ کرنے والوں کی سہولت کے لیے علما نے اس کے مضامین و مطالب کی فہرستیں بھی مرتب کی ہیں۔"نظم البیان بلطائف القرآن" مضامین قرآن مجید کی ایک فہرست ہے جسے مئو کے ایک ممتاز سلفی عالم مولانا ابوالمعالی محمد علی فیضی (۱۲۸۶ھ-۱۳۵۱ھ) نے ترتیب دیا ہے۔وہ ایک مدت تک مئو اور بہار و بنگال کے دینی اداروں میں تدریس میں مصروف رہے اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔انھوں نے کتاب کا جو مسودہ اپنے قلم سے تیار کیا تھا، وہ اس قدر عمدہ تھا کہ ناشر نے از سر نو کتابت کرانے کی بجائے اصل مخطوطے کا عکس شائع کر دیا ہے۔تاکہ مولانا کے دلکش خط اور عمدہ ترتیب کا نمونہ محفوظ رہے۔کتاب میں دو سو کے لگ بھگ موضوعات پر قرآنی حوالے جمع کر دیے گئے ہیں۔ہر صفحے کو پانچ خانوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے جن میں پارہ، سورہ، رکوع، آیت رکوع اور آیت یا آیات کا خلاصہ درج کر دیا گیا ہے۔کتاب کے شروع میں مولف نے دس صفحوں کے مقدمے میں بڑی جامعیت سے اعجاز قرآن اور زیر نظر فہرست موضوعات قرآن کا تعارف کرایا ہے۔اگرچہ اس دور میں اس حوالے سے نہایت عمدہ تالیفات منظر عام پر آچکی ہیں، تاہم تقریباً ایک صدی پیشتر تیار ہونے والی اس فہرست کی افادیت برقرار ہے۔ — ڈاکٹر رحیم بخش شاہین

مدیر کے نام

سلیم منصور خالد' گوجرانوالہ

"پاکستان کی خارجہ پالیسی" (اگست ۹۵) بڑی دلچسپ' اور معلومات افزا پیش کش تھی۔ لیکن اس کے تعارفی نوٹ سے یوں لگتا ہے' جیسے "فارن پالیسی ڈیبیٹ" کتاب فرحت اللہ بابر نے لکھی' اور اس میں پاکستان کے ایٹمی پروگرام کی مخالفت میں لکھا گیا ہے۔ دراصل آئی پی ایس کی یہ کتاب بنیادی طور پر ایک سیمینار کی روداد' مکالموں اور مباحث پر مشتمل ہے۔ اس پوری کتاب میں وزیراعظم کے پریس سکریٹری فرحت اللہ بابر کی واحد تقریر تھی' جس میں پاکستان کے ایٹمی پروگرام کی دفاعی نوعیت کی مخالفت کی گئی ہے۔ اس کے برعکس سیمینار کے تمام مقررین اور باحثین نے پاکستان کے ایٹمی پروگرام کی بھرپور اور مدلل حمایت کی۔

"رسائل و مسائل" میں یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ یہ جوابات کس نے دیے تھے۔

(ترجمان۔ جوابات خرم مراد کے تھے)

نبی احمد وڑائچ' گوجرانوالہ

"پاکستان کہاں کھڑا ہے؟" (اگست) بالکل ہماری تصویر ہے۔ ہمیں تلخ حقائق' جو ہماری اجتماعی بداعمالیوں کا نتیجہ ہیں' کا ادراک کر کے ان کو اللہ تعالیٰ کی تائید و قوت سے بدلنا ہے۔

لطف الرحمن فاروقی' اسلام آباد

"دینی مدارس کا نظام تعلیم" بہت ہی اچھی کوشش ہے۔ انتخاب ایک ہی مکتبہ فکر سے ہے۔ سائنس' ریاضی اور انگریزی کی غیرضروری اہمیت ابھاری گئی۔ معاشرتی علوم کے طلبہ کے لیے ان مضامین کو کتنی اہمیت حاصل ہے؟ عیسائی اداروں میں ان مضامین کی کیا اہمیت ہے؟ دینی مدارس کی اصلاح کے لیے یکساں نظام تعلیم میں اہل حدیث اور اہل تشیع بھی شامل ہو سکتے ہیں۔ اس وقت دینی مدارس کسی مرکز سے وابستہ نہیں' سب اپنی اپنی سہولت کے مطابق ڈگریاں دیتے ہیں۔

ڈاکٹر مقبول شاہد 'لاہور

ایک صاحب نے رسائل و مسائل (جولائی ۹۵) میں یہ شکایت کی ہے کہ ان کی پاؤں کی انگلیوں کی درمیانی جگہ بار بار وضو کرنے سے گل گئی ہے۔ جس تکلیف کا ان صاحب نے ذکر کیا ہے ' یہ ایک قسم کی Fungal Infection ہے جو جلد پر حملہ آور ہوتی ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ نمی سے اس انفیکشن کے بڑھنے میں مدد ملتی ہے لیکن جب تک گندی زمین یا فرش اور قالین وغیرہ سے جرثومے جلد تک منتقل نہ ہوں خالی نمی سے یہ مرض پیدا نہیں ہو سکتا۔ آج کل اس مرض کا اتنا موثر علاج موجود ہے کہ نمی سے بچے بغیر بھی ایک دو ہفتے میں مرض سے شفا ہو جاتی ہے۔ وضو کو اس مرض کی وجہ سمجھنا سائنسی طور سے غلط ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں وضو ہاتھ منہ 'ناک کان اور پاؤں کی صفائی کا ایک انتہائی موثر ذریعہ ہے۔ تام نماد ترقی یافتہ ممالک میں جہاں طہارت کا رواج نہیں ہے اور صرف ٹشو پیپر سے صفائی کی جاتی ہے' وہاں کا ہر شخص ہر وقت اپنے جسم پر غلاظت کی کچھ نہ کچھ مقدار لیے پھرتا ہے اور اس کے کپڑے پیشاب کی بوندوں سے لبریز ہوتے ہیں اگرچہ بظاہر وہ کتنا ہی صاف ستھرا نظر آئے۔ جب میں یورپ میں تھا تو ایک مریض کو ہسپتال لایا گیا جس کے پاؤں گل چکے تھے۔ اس نے کئی ماہ سے اپنے پاؤں دھوئے نہیں تھے۔ وہاں پڑھے لکھے لوگوں کے قریب کلاس روم میں بیٹھنے کا موقع ملا تو ان کی ناک میں سے غلاظت جھانکتی ہوئی نظر آئی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ہم وضو کے دوران ناک اچھی طرح صاف کرتے ہیں۔ یہ بھی اس کی نعمت ہے۔ یورپ میں ہی ہمیں ایک ایسا فلیٹ دیکھنے کا موقع ملا جس میں غسل کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ یہاں اکثر مکان ایسے ہی ہیں۔ غسل کرنے کا اکثر آبادی میں کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ اس کے برعکس اسلام نے ہمیں جمعہ کی نماز کے لیے کم سے کم ہفتے میں ایک بار غسل کے لیے مکمل احکام دیے ہیں۔ جسم کے علاوہ کپڑوں کی صفائی اور طہارت کے بارے میں ہدایات دی گئی ہیں۔ ان سب باتوں کی قدر اس وقت معلوم ہوتی ہے جب اس نعمت سے محروم لوگوں کی زندگی کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملے۔

محمد مسعود الحسن جونیجہ ' میانوالی

ترجمان القرآن باقاعدگی سے پڑھتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی کاوشوں اور محنتوں کو اپنی بارگاہ میں قبولیت بخشے۔ بلاشبہ ترجمان القرآن کا معیار بہت بلند ہوا ہے۔ ترجمان القرآن عوام و خواص کا پسندیدہ رسالہ بن گیا ہے۔ فہم قرآن اور فہم حدیث ہر شمارہ میں شامل کیا کریں۔

محمد یوسف الجبیل 'سعودی عرب

ترجمان القرآن کو ایک جدید 'تحریکی 'علمی اور پالیسی ساز رسالہ بنانے کی کوششوں کو اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور مقاصد میں کامیابی عطا فرمائے۔

REGD. NO. L 5340 PHONES : 7587916
7585590

MONTHLY **TARJUMAN-UL-QURAN** LAHORE